U3932.

Title - MAZAMEEN AZMAT

Creator - Mohd. Azmat Ullah Khan

Publisher - Azam Steam Press (Hyderabad).

Date - 1941

Pages - 258

Subjects - Urdu Mazameen; Tazkira Khan Azmat Ullah Khan, Mohd. - S - O - Tanqeed.

(۹)

مضامین عظمت

حصۂ اول

از

جناب محمد عظمت اللہ خاں بی۔ اے۔ مرحوم
سابق مددگار ناظم تعلیمات سرکار نظام

شایع کردہ
عظمت زبیدہ بیگم

سنہ ۱۹۳۱ء
حیدرآباد دکن

قیمت (عہ)

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر

ملنے کا پتہ

علی اسد اللہ خاں۔ بی ایس سی (عثمانیہ)

برکت بنگلہ۔ ٹھگی جبیل قدیم

حیدر آباد دکن

فہرست مضامین

سلسلہ نشان		صفحہ نشان

ا

حالاتِ زندگی

یورپ والوں نے "جی نیس" (Genius) کی مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن کوئی تعریف ایسی جامع نہیں ہے جس سے (Genius) کا پورا پورا مفہوم سمجھ میں آجائے یا اُس لفظ کا جس شخص پر اطلاق ہوتا ہے اُسکی مکمل تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ اِس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج ایک ایسے ممتاز شخص کی زندگی کا سرسری خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ جسے اِس صفت سے موصوف کرنا چاہتا ہے وہ کسطرح سماج میں پھیلی ہوئی پست اور رکیک فضا، اور ناموافق ماحول سے اپنے آپ کو بچا کر زندگی کے اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے اور اپنے دور رس افکار اور اعلیٰ خیالی میں سالہا سال آگے پہونچ جاتا ہے۔ اور جب اپنی سخت محنت اور جفاکشی سے تمام علوم و فنون پر حاوی ہو جاتا ہے تو اپنے دماغ کی جودت اور طباعی کی کرنیں تمام دُنیا میں پھیلانے لگتا ہے اور اپنے ذخیرۂ علم کے فیضان کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ پارس کی طرح جو اُس کے پاس آتا ہے اُس کو سونا بنا دیتا ہے۔

خاندانی حالات

محمد عظمت اللہ خاں ۱۸۸۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی محمد نعمت اللہ خاں صاحب اور اُن کے دادا

مولوی محمد عظیم اللہ خاں صاحب دہلی کے ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کے ننھیالی بزرگ شاہانِ مغلیہ کے مقربانِ خاص میں سے تھے اور "ورخان" کا خاندانی خطاب عطا ہوا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے موضع رائے پور کھاندہ بطور جاگیر التمغہ مرحمت فرمایا تھا۔ اُن کے پرنانا مولوی رشید الدین خان صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ ہوگئے تھے اور اپنے علمی تبحر میں جواب نہیں رکھتے تھے ان کی تصنیفات مشہور و معروف ہیں۔ اُن کے علم کا چشمۂ فیض ہر طرف جاری تھا۔ اور دُور دور سے تشنگانِ علم سیر ہونے کے لئے آتے تھے۔ (آثار الصنادید اور خزینۃ الاصفیا جلد اول صفحہ ۶۷۶ مطبوعہ مطبع نولکشور میں تفصیل سے حالات درج ہیں) اِن بزرگوں کی علمی فضیلت اور قابلیت اور خاندانی وقار کا شُہرہ سُن کر مختلف والیانِ ریاست نے بڑی جاہ و منزلت سے بلوایا اور ریاست کے سیاہ و سفید کا مختار بنا دیا چنانچہ محمد عظمت اللہ خاں کے ددیالی بزرگوں نے جے پور اور الور کی ریاستوں میں بڑی بڑی خدمات انجام دیں اور انتظامی اُمور میں نمایاں حصہ لیا اور ننھیالی بزرگوں نے ریاست حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں انصرام مملکت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جس وقت مختار الملک نواب سر سالار جنگ اول کو اعلیٰ محکمہ جات کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں، قابل اور معتمد افراد کی ضرورت ہوئی تو اُن کی نظرِ انتخاب محمد عظمت اللہ خاں کے نانا مولوی مؤید الدین خاں صاحب پر پڑی اور نواب صاحب معزز نے ان کو بطور منشیر منتخب فرما کر سر رشتۂ رائے عالم چند سے منصب جاری فرمایا اور ہندوستان سے طلب کیا۔ یہاں پہونچنے کے بعد چونکہ اُن کی کارگذاری پسند فرمائی گئی اِس لئے ہوم سکریٹری کا عہدۂ جلیلہ اُن کے تفویض کیا۔ اوس وقت اکثر اہم محکمہ جات ہوم سکریٹری کے تحت تھے، اُنہیں کے مشورہ سے نواب سر سالار جنگ بہادر نے انتظام جدید

کیا جواب تک باقی ہے۔

مختار الملک نواب سر سالار جنگ بہادر فرمایا کرتے تھے کہ "جب میں نے ملک کے امن و امان و انتظام اور ترقی محاصل و تہذیب دفاتر و محکمہ جات مثل مال و عدالت کوتوالی وغیرہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تو اس کام کے واسطے مجھے دو تجربہ کار اور بیسرے، بہت ہی خیر خواہ ملے۔ ہر انتظامی نقشہ ان ہی دونوں کا جما یا ہوا ہے اُن میں سے ایک مولوی موئید الدین خاں دہلوی ہیں۔" مولوی موئید الدین خاں صاحب کے بعد ان کے صاحبزادہ اور محمد عظمت اللہ خاں کے ماموں مولوی امین الدین خاں صاحب اُن کے جانشین ہوئے اور باقی انتظامی ضرورتوں کی اُنہوں نے تکمیل کر دی اُن کے سپرد بڑے اہم محکمہ جات اور ذمہ داری کے کام تھے مثلاً دفتر ملکی سے مراسلت خریطہ جات معاملات شاہ دکن و وائسرائے ہند اور مراسلت ما بین وزیر دکن و وکیل منجانب وائسرائے بابت اہم معاملات ملکی و معاملات متعلقہ افواج انگریزی مقیم سکندر آباد و بلارم و مفوضہ ملک برار اور مقدمات دیوانی و فوجداری و مال ما بین رعایائے سرکارین وغیرہ۔ یہ مقدمات مولوی امین الدین خاں صاحب اور نائب اول رزیڈنٹ بمشورۂ باہمی فیصل کیا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ مولوی امین الدین خاں صاحب کو بھی نواب سر سالار جنگ بہادر بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہر امر میں ان سے مشورہ فرماتے تھے۔ نواب صاحب مرحوم کے دربار میں اُن کا بڑا رسوخ تھا اور اُن کے مصاحب خاص تھے۔ مولوی صاحب بڑے کم سخن اور خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ شان و شوکت پسند نہیں فرماتے تھے۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق بارسوخ اور مصاحب خاص ہونیکی وجہ سے ایک چھوٹا سا دربار اُن کے مکان پر بھی جمتا تھا۔ اتفاقاً دربار میں آجاتے ورنہ اُن کو نام و نمود سے سروکار نہ تھا۔ مولوی صاحب نے اپنے عروج کے

زمانہ میں اقطاع ہند کے سینکڑوں لوگوں خصوصاً علمائے اودھ وکاکوری ودہلی اور مدراس کو معزز عہدوں پر سرفراز کیا۔ اُن میں قابلِ ذکر ایک تو مولوی سید حسین صاحب (نواب عماد الملک) ہیں جن کو ہندوستان سے بلاکر اپنے پاس مہمان رکھا اور پھر نواب سرسالارجنگ بہادر سے ملواکر معقول عہدہ پر سرفراز کرایا۔ دوسرے مولوی آغا مرزا بیگ صاحب (نواب سرور الملک سرور جنگ) ہیں جو حیدرآباد میں تشریف لانے کے بعد مولوی صاحب سے ملے اور کچھ دنوں بعد دفتر معتمدی عدالت سے روبکار پہونچا کہ آپ دفتر تنقیح حسابات سررشتۂ تعمیرات عامہ میں مامور ہوئے۔ اور دونوں بھائی مولوی شیخ احمد صاحب (نواب رفعت یار جنگ) اور مولوی محمد صدیق صاحب (نواب عماد جنگ) ہیں جن کو پہلے ملازم رکھوایا پھر بڑے بڑے عہدوں تک پہونچایا چنانچہ مولوی صاحب نے مولوی محمد صدیق صاحب کو رکن مجلس عالیہ عدالت تک پہونچادیا تھا۔ (کارنامۂ سروری مصنفہ نواب سرور جنگ بہادر)۔

سر رچرڈ ٹمپل نے جو اس زمانہ میں حیدرآباد میں رزیڈنٹ تھے (اور بعد میں بمبئی کے گورنر ہوئے) اپنی کتاب موسومہ "Journals kept in Hyderabad" میں ممدوح الصدر بزرگوں کی اعلیٰ خدمات کا تذکرہ اِن الفاظ میں کیا ہے "معتمدین قابل اور آزمودہ کار مولویوں میں سے تھے۔ اُن میں سے چند نے اپنی اعلیٰ قابلیت دیانت اور خوش انتظامی سے اپنے عہدوں کی شان بڑھادی تھی۔ انہی میں مولوی مؤید الدین (خاں صاحب) اور اُن کے صاحبزادہ مولوی امین الدین (خاں صاحب) تھے جو جوڈیشل ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے"۔

مذکور الصدر بزرگوں کے علاوہ ایک دوسرے ماموں مولوی محی الدین خاں صاحب میر مجلس عدالت العالیہ کے ممتاز عہدہ پر پہنچکر وظیفہ حسن خدمت پر

ریٹائر ہوئے اور اسی طرح ایک چچا نواب سر بلند جنگ بھی میر مجلس عدالت العالیہ ہوئے اور یہیں سے وظیفۂ حسن خدمت حاصل کیا۔

درس و تدریس کا سلسلہ

تعلیم کی تکمیل کرکے حیدرآباد واپس آنے کے بعد انہوں نے سرکاری طور پر انگلستان جانے کی کوشش کی کیونکہ انہیں انگلستان جانے کی بہت دنوں سے آرزو تھی۔ یہ کوشش انہوں نے کئی سال تک کی۔ لیکن ہر سال ناکامی کی صورت دیکھنی نصیب ہوئی۔ یہ محرومی گو دل شکن تھی لیکن انہوں نے اس تین چار سال کی انتظار کی مدت سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا۔ کتب بینی کا سلسلہ پہلے سے زیادہ زوروں پر رہا۔ حیدرآباد کے ہر سرکاری اور خانگی کتب خانے سے کتابیں منگواتے اور ان کا مطالعہ کیا کرتے۔ فلسفہ، تاریخ، سیاست، تمدن، معاشیات عمرانیات (Socialogy) انتھراپالوجی (Anthropology) فلکیات ارضیات، حیاتیات، طبیعیات۔ غرض کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس کا انہوں نے گہرا مطالعہ نہ کیا ہو۔ اور اس پر نوٹس نہ لکھے ہوں۔ اس کتب بینی کے علاوہ وہ اپنی علمی قابلیت اور معلومات سے دوسروں کو مستفیض بھی کیا کرتے۔ آپکے احباب کا حلقہ وسیع تھا جن میں سے اکثر اُن سے اپنی انگریزی کی استعداد بڑھانے میں مدد لیتے رفتہ رفتہ اُن کی قابلیت اور علمی شوق اور پڑھانے کی دلچسپی کا شہرہ ہوا تو بہت سے شوقین طالب علموں نے پڑھنے کے لئے آنا شروع کیا اور یہ بڑے شوق سے اور مفت، فلسفہ، معاشیات اور بالخصوص انگریزی کی تعلیم دیا کرتے۔ اُن پڑھنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے چند ناموں کا پتہ چلا ہے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنی لیاقت اور ذہانت سے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر لیئے ہیں۔ مثلاً مولوی غلام محمود صاحب قریشی

(حال نرانۂ معتمد مال) مولوی حبیب الرحمٰن صاحب (حال ناظم معلومات عامہ) - مولوی احمد محی الدین صاحب (حال ناظم رجسٹریشن) مولوی محمد یونس صاحب انجینیر خلف الرشید مولوی عطا حسین صاحب - مولوی یوسف علی صاحب برادر زادہ مولوی ناظم علی صاحب - مولوی احمد عثمانی صاحب (حال لکچرار سٹی کالج) نواب سید سجاد حسین صاحب - مولوی احمد علی صاحب (حال صدر مدرس) برادر مولوی ظہور علی صاحب مولوی حسام الدین صاحب مرحوم سابق ناظم انجمن امداد باہمی -

دہلی کو روانگی

جب انگلستان جانے کے لئے کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی اور اُن کی والدہ ماجدہ نے اصرار کیا تو یہ اپنی شادی کے لئے دہلی چلے گئے - وہاں اہلِ علم اور ادیبوں سے مُلاقاتیں رہیں اور کتب بینی کا سلسلہ بھی جاری رکھا - اس کے ساتھ یہاں ہندی بھی پڑھی - ایک سنسکرت جاننے والے پنڈت صاحب بھی ملاقات کو آیا کرتے تھے اُن سے سنسکرت کے متعلق بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل کی - اِسی دُوران میں ڈاکٹر لطیفی صاحب ناظم تعلیمات نے تار بھیجکر اُن کو حیدرآباد بلایا اور یہ محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہوگئے پہلے کچھ عرصہ تک اِسکول میں رہے اوس کے بعد نواب مسعود جنگ کے زمانہ میں مددگار ناظم تعلیمات ہوگئے -

دفتری زندگی کا ایک واقعہ

اسی زمانہ میں جامعہ عثمانیہ کی بنیاد پڑی - اور اُس کے ساتھ دفتر معتمد (Regigterar) کی ضرورت پیش آئی - اِس دفتر کی تنظیم اور قواعد و ضوابط کی ترتیب کے لئے مولوی سید محی الدین صاحب اور محمد عظمت اللہ خاں بھیجے گئے - جن لوگوں نے خاں صاحب کو اپنے مکان میں مہینوں، رات کے تین تین بجے تک دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کرتے دیکھا ہے - وہی اِس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں

کہ انہوں نے قواعد اور ضوابط کی ترتیب اور دفتر کی تنظیم میں کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی۔ جب یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا تو پھر خاں صاحب اپنی سابقہ خدمت مددگاری نظامت پر واپس ہو گئے۔

تصنیف اور تالیف کا سلسلہ اب یہاں سے باقاعدہ اُردو میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یوں تو پہلے بھی حیدرآباد کے ہر رسالہ اور اخبار کے ایڈیٹر آتے اور کوئی نہ کوئی مضمون لکھوا کر لیجاتے۔ اُس وقت بھی قادر الکلامی کی یہ حالت تھی۔ کہ جس رنگ میں چاہتے نثر اور نظم لکھ سکتے تھے۔ ایک مقامی اخبار کے اڈیٹر جن سے دوستی بھی تھی۔ ایک دن فرمائش کرنے لگے کہ "چہار درویش" کی قسم کا قصہ نئے رنگ اور جدید طرز پر پھڑکتی ہوئی عبارت میں مجھے لکھ دیجئے۔ خاں صاحب نے کہا میں آپکی فرمائش پوری تو کرتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ میں بولتا جاؤں اور آپ لکھتے جائیں دوسرے یہ کہ آپ قصہ میرے نام سے نہ چھپوائیں۔ مختصر یہ کہ قصہ میں مغربی خیالات کے فیشنبل شوقینوں کی ایک کلب قائم ہوئی اور تجویز یہ ہوئی کہ ہر جلسہ میں الف لیلہ ڈنر ہوا کرے جس میں کلب کا ایک ممبر اپنی سرگزشت بیان کیا کرے۔ اسطرح الف لیلہ ڈنر کی ایک سرگزشت ۹۲ صفحوں میں تکمیل کو پہنچی اڈیٹر صاحب نے اس کو پہلے حصہ کے طور پر "منچلے" کے نام سے شایع کرا دیا۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکی اور ختم ہو گئی کہا کرتے تھے کہ میں نے کچھ تو مذاق مذاق میں اپنے دوست کی فرمائش پوری کرنے کے لئے اور کچھ یہ دیکھنے کے لئے کہ میری اس تحریر کا لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ قصہ لکھوایا۔ ورنہ میں اس قسم کے ادب کو پسند نہیں کرتا۔ بعد میں اڈیٹر صاحب "نقیب" نے اس "منچلے" کو دوبارہ نہایت نفیس کاغذ پر بغیر اجازت چھپوا دیا جن اصحاب نے اس کو پڑھا ہے وہ تحریر کے زور، عبارت کی رنگینی اور جدت طرازی کے قائل ہوئے بغیر نہ رہے۔

یہ تو پہلے کی بات تھی لیکن اب تحریر کی ایک خاص روش اور حکیمانہ موضوع کے ساتھ مضامین لکھنا شروع کیئے۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ معاشی یا سیاسی یا فلسفیانہ مضامین اگر شروع سے آخر تک سنجیدہ اور ٹھوس ہوں تو بہت ہی کم لوگ اُن کے پڑھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں البتہ اگر انہی مضامین کو خوش مذاقی (Humour) کی چاشنی دیکر لکھا جائے تو عام و خاص سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور اس طرح پیچیدہ اور فلسفیانہ مسائل کو مصنف باتوں باتوں میں اُن کے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے سیاسی، معاشی اور حکیمانہ مسائل اور الٰہیات کے رموز کو سلیس اور ٹھیٹھ اردو میں خوش مذاقی کے رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ ہندوستان میں ان مضامین کی مانگ بڑھی۔ نقیب۔ علی گڑھ میگزین۔ نیرنگ خیال، ترقی، بہارستان، ہمایوں، اُردو غرض کوئی اُردو کا رسالہ نہ تھا جس میں اُن کے مضمون نہ شائع ہوتے۔ اہل ذوق نے یہ مضامین بڑے شوق سے پڑھے اور دل کھول کر تعریف کی۔ خاں صاحب کے رنگ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ مضمون کی ابتدا خوش مذاقی کا پہلو لئے ہوئے عام فہم اور روزمرہ کی زبان میں کرتے۔ جس میں چلبلے پن شوخی اور ظرافت کی چاشنی ملی ہوئی ہوتی۔ مضمون کی اٹھان میں اسی رنگ کو قائم رکھتے ہوئے بلند پروازی کرتے کرتے زمین سے آسمان پہ پہنچ جاتے اور آخر میں تو وہاں سے تارے ہی توڑ لاتے۔ مولانا ماجد صاحب گڈیا خانہ والا مضمون پڑھکر نہ رہ سکے۔ اور ایک خط کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا "گڈیا خانے والے مضمون میں آپ نے فلسفے کو جس طرح پانی کیا ہے وہ میرے لئے قابل رشک ہے" جناب آفتاب احمد خاں صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انگلستان تشریف لیجا رہے تھے تو راستے میں سورا چینا پڑھا اور جہاز سے ہی

خط لکھا کہ "مجھے مدت سے اس بات کی خواہش تھی کہ ہندوستانی نوجوان ادیب اسی قسم کے مضامین لکھیں۔ آپ کے مضمون سے میری یہ خواہش پوری ہو گئی اگر میری واپسی کے بعد آپ مجھ سے ملیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔" مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب مشہور انشا پرداز "مضامین فرحت حصّہ چہارم" میں تحریر فرماتے ہیں "مطالعہ کے شوق نے اُن کی معلومات کو وسعت دی۔ اُن کی تحریر میں قوت پیدا کی۔ اُن کے قلم میں زور دکھایا یہی مطالعہ تھا جس نے اُن کو مختلف زبانوں کے طرزِ تحریر سے باخبر کیا۔ مختلف خیالات سے آگاہ کیا۔ اور بالآخر اُنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے طریقہ پر شروع کیا جس میں انگریزی کی متانت فرانسیسی کی شوخی فارسی کی ظرافت اور ہندی کے درد کی جھلک تھی۔" اور حضرت اختر شیرانی صاحب جس وقت وہ "بہارستان" کے اڈیٹر تھے ایک مضمون "زندہ بدست مُردہ" پر تحریر فرماتے ہیں۔

"اس مضمون میں بتلایا گیا ہے کہ جدّت کیا چیز ہے کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اور وہ کون سے اسباب ہیں جو جدّتوں کے نشو ونما میں امداد پہنچا سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع کو چھیڑنا بھی بجائے خود ایک جدّت ہے اور اس لئے قابلِ داد ہے۔ پھر فاضل مضمون نگار کا وہ اندازِ تحریر جو نت نئی جدّتوں سے لبریز ہے ایک علیحدہ اور مستقل قصیدہ کا طلبگار ہے غرض ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

"زندہ بدستِ مُردہ" ایک "بے ڈھب" مضمون ہے اس میں مضمون نگار کا لب و لہجہ جس حد تک آزادانہ، بیخوف اور تبسم آفرین رہا ہے وہ ہمارے اکثر اہلِ قلم کے لئے سبق آموز ہے۔ کچھ شک نہیں کہ ہم میں جب تک ایسے نڈر اور بے دھڑک لکھنے والے پیدا نہ ہونگے جو بے تکلف اور بلا کسی مصلحت کے

ا اندیشہ کے نئے نئے خیالات کو ادا کرنے کی جرات کریں۔ ادب کی ترقی محال ہے۔
یہ مضمون پڑھکر ناظرین کو ہماری طرح بے ساختہ ہنسی آجائیگی لیکن ساتھ ہی ہم یقیناً
کہہ سکتے ہیں کہ استدلال کی صداقت کا اثر بھی رائیگاں نہ جائیگا۔"

غرض بڑے بڑے عالم و فاضل اور چوٹی کے ادیبوں نے دل کھول کر داد دی
مضامین کا مجموعہ اب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ آپ خود ملاحظہ فرما کر اندازہ
فرما لیجیگا۔

مضامین اور نظموں کے علاوہ خاں صاحب تمام اصناف سخن پر حاوی تھے۔
ایک طبعزاد ڈرامہ لکھا تھا جس کا نام "شاعر کا ڈرامہ" تھا جو بہت پسند کیا گیا (افسوس
ہے کہ یہ ڈرامہ اب کہیں سے دستیاب نہ ہوسکا) سولیئر کے دو تین ڈراموں کو اردو
کا جامہ پہنایا۔ نواب مسعود جنگ بہادر کے انگریزی میں لکھے ہوئے سفرنامہ جاپان
کا اردو میں "روح جاپان" کے نام سے ترجمہ کیا جو اپنی نظیر آپ ہے۔ رسالۂ المعلم
کی جائنٹ ایڈیٹری کے زمانہ میں جو نوٹ اور تنقیدیں لکھی ہیں وہ اپنی ادبی نفاست
اور علمی بردباری کے لحاظ سے ادب عالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ خاں صاحب نثر میں بھی ہندی
کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اُن کی نثر دہلی کی ٹھیٹھ اردو میں ہوتی تھی البتہ ایک
دو ایسے لفظ جن کو یا تو دہلی کے خاص و عام بولتے ہیں۔ یا انگریزی اصطلاح کا ترجمہ جس
کے لئے اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے اپنے مضامین میں استعمال کئے ہیں۔
مثلاً "سوسائٹی" کے لئے "سماج" انھوں نے گھڑا تھا اور اس کو کئی جگہ استعمال
کیا ہے اب یہ لفظ اتنا عام ہوگیا ہے کہ اردو کا ہی لفظ معلوم ہوتا ہے۔

سیرت اور کردار | میں حیران ہوں کہ سیرت کے ذکر میں کس خوبی کا ذکر کروں
اور اُن کے کیرکٹر کا کونسا رخ دکھاؤں؟ وہ تو مجسم خوبی تھے

جو لوگ اُن سے مل چکے ہیں اور جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ ایسا ہمدرد، خوش خلق، ہنس مکھ، پرخلوص، باوضع اور بامروت انسان دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہر چھوٹے بڑے اَدنیٰ اعلیٰ کے لئے اُن کا دیوان خانہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اور وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ دن رات اہلِ ذوقِ سخن سخنوں اور اَدیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اڈیٹر مجلہ عثمانیہ، نے خوب کہا ہے کہ ”اُن کی صحبتوں میں ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھی چاندنی کا مزہ آتا تھا“ کبھی اپنا مضمون سنا رہے ہیں کبھی اپنی تازہ نظم پڑھ رہے ہیں کوئی مضمون نگاری کا شوقین اپنا مضمون سنا رہا ہے تو کوئی شاعر اپنی نظم سنا رہا ہے یہ خندہ پیشانی کے ساتھ داد دے دے کر اُن کا دل بڑھا رہے ہیں۔ اور باتوں باتوں میں اُن کو ایسے ڈگر پر ڈال رہے ہیں جو اُن کی طبیعت کے موزوں ہو۔ غرض دن رات علمی تذکرے اور بحث مباحثہ رہتے تھے۔ سینکڑوں کو انہوں نے مضمون نگار اور بیسیوں کو شاعر بنا دیا۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

”آرام کرسی بچھی ہے عظمت اللہ خاں بیٹھے ہیں اِدھر اُدھر کرسیوں پر ملنے والے بیٹھے ہیں کسی کے مضمون کی تعریف ہو رہی ہے کسی کو مشورہ دیا جا رہا ہے کسی کو سمجھا رہے ہیں۔ کسی کو پڑھا رہے ہیں۔ غرض ایک اَدیب کا دربار ہے کہ لگا ہوا ہے۔ جو شخص اُن کے پاس آتا ہے وہ کچھ فائدہ ہی اُٹھا کر جاتا ہے جس شخص سے ملتے ہیں اُستاد بن کر نہیں صلاح کار بن کر ملتے ہیں کچھ اُس کو بتاتے ہیں کچھ اُس سے سیکھتے ہیں بس یہ سمجھو کہ ایک دریا ہے کہ اپنے کناروں کو سیراب کر رہا ہے اور اُن شاداب کناروں سے خود بھی لطف اُٹھا رہا ہے۔ میں گیا اور وہ اپنی کرسی سے اُٹھے ”آیئے آغا آیئے بھائی صاحب آپ کی تو صورت ہی نظر نہیں آتی۔ آج کچھ لکھ لائے ہیں ہاں۔ آغا، ہاں سنایئے خدا کے لئے آپ اپنا قلم نہ روکئے۔

آپ کی یہ کوتاہ قلمی زبان اُردو پر ظلم کر رہی ہے" مضمون سُنتے، داد دیتے جہاں کمزوری ہوتی وہاں بہت کچھ اس طرح بتا جاتے کہ مشورہ تو کیا خاصی اِصلاح ہو جاتی"

مرزا صاحب موصوف " اپنے متعلق خود میرے خیالات " مضامین فرحت حصہ اوّل میں فرماتے ہیں :-

" تعریف کرنی ہے تو میرے کرم فرماؤں کے نام سن لیجئے اِس سلسلے میں سب سے پہلے محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے مرحوم کا نام آتا ہے وہی پہلے شخص تھے جن کو خیال پیدا ہوا کہ یہ شخص کچھ لکھ سکتا ہے وہ مر گئے ہم کو مرنا ہے لیکن اگر میرا کوئی مضمون زندہ رہ گیا تو اسی مرنے والے کا صدقہ سمجھئے"

ایسے دوست احباب بھی آتے تھے جو گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں ملاتے اور جنکی باتیں ایسی علمی فضا والی جگہ میں فضول کہی جا سکتی ہیں لیکن اُن کی تیوری پر کبھی بل نہ آیا۔ یہ اِس طرح اُن سے باتوں میں مشغول ہو جاتے جیسے اُن کو بڑی دلچسپی ہے۔ اِس طرح باتوں میں رات کے بارہ بارہ بج جاتے۔ لیکن یہ ہیں کہ اُسی طرح ہنس مکھ چہرے کے ساتھ باتیں کئے جاتے ہیں۔ اُن میں سے چند نے اُن کی مروت اور اخلاق سے بیجا فائدہ اُٹھا کر اِس طرح نرغہ میں لے لیا تھا کہ اُن کو مضمون یا نظم لکھنے کا تعطیلا میں بھی موقع نہ ملتا۔ اور مجبوراً رات کے گیارہ بجے کے بعد سے لکھا کرتے۔ اِس کا اُن کی صحت پر خراب اثر پڑا۔ چونکہ یہ با اِقتدار عہدہ دار تھے۔ اِس لئے اہل غرض بھی بہت سے آتے تھے۔ ہر ایک سے سلوک تو اُن کا خاص وتیرہ تھا۔ اور پھر اُن عہدے داروں کی طرح نہیں جو چھوٹے سے چھوٹے کام کو اپنے اِحسان کی اہمیت جتانے کے لئے بڑا مشکل بتاتے ہیں۔ اور حاجتمند کے اپنے گھر اور دفتر کے بیسیوں چکر کرواتے یہ تو ہر شخص کے بڑے سے بڑے کام کو بھی فوراً ہی کر دیتے جس سے

اُس شخص کے دِل میں اِس کام کی شاید اہمیت ہی نہ باقی رہتی۔ اور احسان تو آج تک کسی شخص نے مانا ہی نہیں حالانکہ اُنہوں نے جتنے احسانات لوگوں پر کئے ہیں شاید ہی کسی نے کئے ہوں۔ بعض دُنیادار اِس قسم کے بھی آتے جو خوشامدانہ باتیں کر کے اپنا کام نکالنا چاہتے۔ اور اُن کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سیدھا سادہ سا بچہ سمجھ کر چکمہ دیکر اپنا کام نکال رہے ہیں اُن پر ہر شخص کی ظاہری حالت تو کیا اُس کے دل کی اندرونی حالت بھی عیاں ہو جاتی لیکن یہ انجان بن کر اپنی عادتی مروت اور خوش اخلاقی سے اُن کا کام بھی اِس انداز سے کر دیتے گویا اُن کا اُن پر کچھ حق ہے اور آخر تک یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ اُنہوں نے اُن کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

رفتہ رفتہ اُن کے پاس اہلِ علم حضرات کا مجمع بڑھنے لگا مولوی غلام مصطفےٰ صاحب ذہین اکثر آیا کرتے تھے اُن کو بچوں کی نظموں کی طرف لگا دیا۔ حکیم الشعراء مولانا امجد صاحب مشہور صوفی منش شاعر بھی تشریف لاتے حیدرآباد میں سب لوگ اُن کی عزت و وقعت کرتے ہیں۔ بڑے ہی خدا رسیدہ اور اہلِ دل بزرگوں میں سے ہیں۔ خدا جانے اُنہوں نے خاں صاحب میں کونسی بات دیکھی تھی کہ وہ اُن کے بڑے گرویدہ تھے۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ خاں صاحب نے اسی زمانے میں حضرت خواجہ میر دردؔ پر ایک مضمون لکھا تھا وہ مضمون جس سوز و گداز اور والہانہ انداز سے لکھا گیا ہے اہلِ دل ہی کچھ اِس کی قدر کر سکتے ہیں۔ خاں صاحب کی نجات کے لئے وہ ایک مضمون ہی کافی ہے۔ خاں صاحب کے اِنتقال کے بعد مولانا امجد صاحب نے اپنے پاس اُن کی فاتحہ کرائی اور اپنی دلی کیفیت کے اظہار کے لئے ایک نوحہ و تاریخ شائع کرائی۔ (جو اِس مضمون کے آخر میں درج ہے۔) مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بھی اپنے مضمون سُنانے کے لئے اکثر

تشریف لایا کرتے۔ مولانا وحید الدین صاحب سلیم بھی رونق افروز ہوا کرتے تھے۔

مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مضامین "مضامین فرحت" حصّہ ششم۔ میں حافظ عبدالرحمٰن خان "احسان" کے حالات لکھے ہیں جس میں انہوں نے صفحہ ۱۶۴ پر تحریر فرمایا ہے کہ محمد عظمت اللہ خان مرحوم عبدالحکیم خاں کے نواسے ہیں۔

یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے محمد عظمت اللہ خاں مرحوم عبدالحکیم خاں کے نواسے نہیں ہوتے تھے۔

وفات آخر باغ دنیا کے اس شاداب پھول کو نظر لگ گئی۔ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۷ء میں ۴۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

نوحہ
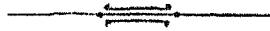
(از)

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدر آبادی

تقدیر نے دکھلایا عجب واقعہ جانکاہ — العظمت للہ
بجلی سی گری خرمنِ امید پہ ناگاہ — العظمت للہ
رخصت ہوا دُنیا سے عجب دوست ہمارا — تھا آنکھ کا تارا
ہر دوست کا دِل شدّتِ غم سے ہوا پارا — العظمت للہ
وہ، جس کو کبھی چیں بہ جبیں ہم نے نہ دیکھا — اخلاق کا پُتلا
کیا آن تھی، کیا شان تھی، کیا صورتِ زیبا — العظمت للہ
وہ، جس کو تنفر رہا شہرت طلبی سے — کم ہوتے ہیں ایسے
وہ، پھول جو مُرجھا گیا کھلنے ہی سے پہلے — العظمت للہ
وہ، جو تھا بہت عمر میں کم، عقل میں بوڑھا — اُس سے بھی زیادہ
اَڑتیس برس میں کیا دنیا سے کنارا — العظمت للہ
وہ لعل شکر ریز، وہ تصویر محبت — وہ چاند سی صورت
یوں خاک میں مِل جائے سراپائے شرافت — العظمت للہ
وہ جس کی ہر اک بات تھی تفریح دل وجان — بے مثل سخندان
چُپ چاپ چلا جائے سوئے شہرِ خموشاں — العظمت للہ

وہ، مصدرِ الطاف، وہ اخلاص کا مظہر — اخلاق کا محور
افسوس کہ ہو جائے نہ ہونے کے برابر — العظمت للہ

وہ، علم ادب کے لئے جو روحِ رواں ہو — اعجازِ بیاں ہو
یوں دیکھتے ہی دیکھتے بے نام و نشاں ہو — العظمت للہ

وہ چھوڑ کے بچوں کو یہاں سے ترا جانا — ہونا وہ روانا
وہ عالمِ غربت میں، تری موت کا آنا — العظمت للہ

ظالم نے نہ کچھ رحم کیا ایسے حسیں پر — خاک ایسی زمیں پر
یہ چادرِ خاک، اور رخِ ماہ جبیں پر — العظمت للہ

اِن چھوٹے سے بچوں کو کیا کس کے حوالے — ہیں نازوں کے پالے
اِک مادرِ بیوہ، انہیں کس طرح سنبھالے — العظمت للہ

محروم رہے آخری دیدار سے بھی ہم — تیمار سے بھی ہم
گویا گئے گزرے ہوئے اغیار سے بھی ہم — العظمت للہ

تھا قدر شناس، آہ جو امجد کا وطن ہیں — اس ملک دکن میں
منہ اپنا لپیٹے ہوئے سوتا ہے کفن میں — العظمت للہ

ہیہات گلِ سرسبد از باغِ جہاں رفت — در شوقِ جناں رفت
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں رفت — العظمت للہ

رو دھو کے تجھے کر دیا مولا کے حوالے — اے خوبیوں والے
اللہ تجھے کیوں قرب میں اپنے نہ بلا لے — العظمت للہ

زندہ بدستِ مُردہ

جن لوگوں کے کان "مُردہ بدستِ زندہ" کی عالمگیر کہاوت سے آشنا ہیں اُن کے لئے "زندہ بدستِ مردہ" کی انوکھی آواز بہت کچھ حیرت و تعجب کا باعث ہوگی ——— اگر یہ صحیح ہے کہ "جدت کے بغیر کوئی ادب ترقی نہیں کرسکتا" تو اِس میں بھی کلام نہیں کہ جدّت کا حکم جس حد تک خیالات کے لئے ضروری ہے اُسی حد تک مضمون اور عنوانِ مضمون کے لئے بھی لازمی ہے اور اِس لحاظ سے "سرنامہ" کی شوخی یقیناً ادبی جواز سے محروم نہیں ہوسکتی۔ جدت اچھی ہو یا بُری، اس کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جدت ہے اور اگر دنیا فرسودگی پرست نہیں ہے تو اس کے لئے ہر ایک جدت کی بلحاظ جدت کے داد دینا ضروری ہے ——— مثلاً پرستانِ مغرب کی اکثر مہ جبینوں کا لباس کی قید و بند سے آزادی حاصل کرکے وہ جامہ اختیار کرلینا کہ "جس کا نہیں سیدھا الٹا" یقیناً ایک دلچسپ جدت ہے اور قانون کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اِس جدت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرے اِسی طرح قدیم و جدید شجاعت کے اظہار سے مختلف، ابن سعود کا مُردوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا دنیائے شجاعت میں دلیرانہ جدت سے کم نہیں اور اگر

مولانا محمد علی صاحب قبلہ اور اُن کے پیرو اس کو پسند نہیں فرماتے تو اس کے
سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان میں قدامت پرستی کا مادہ بہت ہے ——— !
بہر حال کہنا یہ ہے کہ جو اہل ذوق جدت کو بلحاظ جدت کے پسند فرماتے ہیں
اُن کے لئے ہمارے محترم مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی بی۔ اے
(علیگ) کا یہ مضمون بہت سی اہم دلچسپیوں کا حامل ثابت ہوگا ———
اس مضمون میں بتلایا گیا ہے کہ جدت کیا چیز ہے کس طرح کی جا سکتی ہے ؟
اور وہ کون سے اسباب ہیں جو جدتوں کی نشو ونما میں امداد پہنچا سکتے ہیں ؟ ہم
سمجھتے ہیں کہ اس موضوع کو چھیڑنا بھی بجائے خود ایک جدت ہے اور اسلئے
قابلِ داد ہے۔ پھر فاضل مضمون نگار کا وہ انداز تحریر، جو نت نئی جدتوں سے
لبریز ہے ایک علیحدہ اور مستقل قصیدہ کا طلبگار ہے غرض ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

زندہ بدستِ مردہ ایک "بے ڈھب" مضمون ہے اس میں مضمون
نگار کا لب و لہجہ جس حد تک آزادانہ، بیخوف، اور تبسم آفریں رہا ہے وہ ہمارے
اکثر اہل قلم کے لئے سبق آموز ہے کچھ شک نہیں کہ ہم میں جب تک ایسے
نڈر اور بے دھڑک لکھنے والے پیدا نہ ہونگے جو بے تکلف اور بلا کسی مصلحت
کے اندیشہ کے نئے نئے خیالات کو ادا کرنے کی جرات کریں، ادب کی ترقی محال ہے
——— یہ مضمون پڑھ کر ناظرین کو ہماری طرح بے ساختہ ہنسی آجائے گی۔
لیکن ساتھ ہی ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ استدلال کی صداقت کا اثر بھی رائیگاں نہ
جائے گا۔ اور بالآخر آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ "ہاں کچھ ہے" ——— !
ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان لوگوں کے حق میں جو برسوں سے قدامت پرستی

کے سومنات میں پیشانیاں رگڑ رہے ہیں یہ مضمون ایک اچانک حادثہ کا کام
دے گا اور ان کے صدیوں کے تراشے ہوئے مقدس بت آناً فاناً میں
ڈھ پڑیں گے اگر ایسا ہوا تو ہمیں یہ کہنے میں عذر نہیں کہ بہارستان ہر وقت
اُن کی گالیاں سننے کو آمادہ رہے گا۔ ع

تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر!

آخر میں ہم محترم مضمون نگار کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر
اس سلسلہ کو (حسبِ وعدہ) وسیع کر دیا جائے تو یہ اُردو ادب کی ایک بہترین
اور ضروری خدمت ہوگی اور بہارستان اس کے لئے ہمیشہ اُن کا زیر بارِ
احسان رہے گا۔

اختر (شیرانی)

نقاد اپنی قیمتی رائے کے خلاف کسی بات کو مانتے نہیں۔ اور یہی اُن کے
نقاد ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے لیکن یورپ کے بڑے بڑے نقادوں
نے بھی ایک بات عام طور پر تسلیم کر لی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ادب میں بھی
اور علوم کی طرح اسی وقت ترقی ہو سکتی ہے کہ اربابِ قلم جدت سے
کام لیں۔

جدت کیا ہے اور کس طرح کی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں سوال بے ڈھب
سے ہیں۔ پہلے سوال کا ایک مزیدار جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جدت وہ
چیز ہے جو نقادوں کو نصیب نہیں۔ اس کے علاوہ اور طرح بھی یہ سمجھایا
جا سکتا ہے کہ جدت کیا ہے۔ رہا یہ کہ جدت کس طرح کی جائے۔ اس کا
کوئی جواب نہیں۔ جدت کرنا کوئی جامعہ (یونیورسٹی) بھی نہیں سکھا سکتی
بلکہ درسگاہوں میں جدت ذرا مشتبہ نظروں سے ہی دیکھی جاتی ہے۔ صاحب

جدت طالب علم انگلستان کی نامور جامعوں میں بھی مشکل سے ہی پنپ سکتا ہے۔
شے لی ( ) اور سون برن ( ) کی طرح جدت کے ماتے طلبہ کو بھاگ
جانا پڑتا ہے ـــــ یا اُن کو بھگا دیا جاتا ہے۔ تو اب مشکل صورت یہ ہے
کہ ایک طرف تو جدت کوئی سکھا نہیں سکتا۔ اور دوسری طرف بغیر جدت
کے کوئی اَدب ترقی نہیں کر سکتا۔ اُردو اَدب کا یہ حال ہے کہ دُنیا میں بہت
پھسڈی ہے نتیجہ یہ کہ پھسڈی ہی رہے گا۔ کیونکہ ایک تو یوں ہی مریل سا
پھپھوندر لگا۔ اور اُس پر یہ خُدا کی مار کہ قدامت پسندوں کے ہاتھوں اُردو
کی دُنیا مردم خیز نہیں۔ جدت پسند دماغ پیدا نہیں کرتی۔

یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جدت کی طرح دریافت کرنی چاہیئے اور اگر اُس کا راز
ہاتھ آگیا تو پھر کیا ہے چین لکھتا ہے شہرت ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہوگی
اخباروں اور رسالوں میں اپنے ہی نام کا کلمہ پڑھا جائے گا۔ اور درود دیوا[ر]
کیا۔ یہ تو ریڈیو کا زمانہ ہے ہوا کے ذروں تک سے واہ واہ کی صدا آئے گی۔
اس لالچ میں ـــــ اور یہ شہرت طلبی کی کمزوری ہر انسان چھوٹا ہو یا بڑا
ماں کے پیٹ سے لاتا ہے۔ اس کمزوری کے دباؤ میں اس طرف دھیان
دوڑانا شروع کیا۔ دیکھا کہ یہ کوئی انوکھی کوشش نہیں ہے۔ ترقی کے قبلہ و کعبہ
یورپ نے اس میدان میں بھی چھان بین کی حد کر دی ہے۔ اور کوشش
ہے کہ یورپی مدرسوں اور جامعوں میں سے جو طالب علم نکلے وہ جدت پسند
بن کر نکلے۔

لیکن جدت اُس کا طلسم وہاں بھی نہیں ٹوٹا۔ اتنی بات ضرور پیدا ہوگئی
ہے کہ یورپ میں جدت کی قدر دانی نے جدت کی چیٹک یا سنک کہیئے ان
دماغوں کو بھی لگا دی ہے جو ماں کے پیٹ سے جدت اُس کا عطیہ نہیں لائے ہیں

اس معاملہ میں یورپ کے سرچشموں سے بھی پیاسا ہی پھرنا پڑا۔ یہ راز نہ کھلا کہ جدت کس طرح کی جائے شہرت کی دلفریب دیوی کالے کوسوں دور ہوگئی۔ واہ واہ کے سہرے کے پھول ایسے مرجھائے کہ برف کی طرح گھل گھلا کر تخیل سے غایب ہو گئے۔ اس زبردست مایوسی سے پہلے تو دل بجھ سا گیا لیکن رفتہ رفتہ شہرت کی پری کے ان دیکھے چہرہ نے پھر دل کو کھینچنا شروع کیا۔ جدت کی طلم کے ہاتھ نہ آنے پر فطرتاً غصہ آنے لگا۔ اس وقت ظرافت کی دیوی نے اپنی ہلکی چاندی کی گھنٹیوں کی سی کھلکھلاہٹ سنائی اور گدی پر اپنا گدرا گدرا گدگداتا ہاتھ رکھکر سمجھایا کہ جدت کی جان میں ہوں۔ ہر ہنسی کی بات جدت ہے میری ہی دلکشا روشنی میں جدت کو طلم سجھائی دے گی ایسے نفسیاتی موقع پر حسنِ اتفاق سے ایک لطیفہ پیش آیا جس نے اس ظرافت کی کرن کو کرنوں کی لڑ بنا دیا۔

ایک سن رسیدہ بزرگ اپنے آپ کو اردو ادب کا بڑا ہی ہوا خواہ جانتے تھے۔ اور یہ جملہ اکثر فرما دیا کرتے تھے۔

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کی تعلیم سے ویسے دماغ کیوں نہیں پیدا ہوتے جیسے اگلے وقتوں میں ہوئے ہیں"

ہر ادبی محفل میں یہ قابلِ احترام بزرگ اس حیرت بھرے سوال کو اپنے خاص انداز میں ایک آدھ دفعہ ضرور پھڑکا دیتے تھے لیکن جب کوئی ادبی جدت اُن کے سامنے آتی تو بدک جاتے اور فوراً تخریبی تنقید پر تل پڑتے اپنے اگلے وقتوں کے عالی دماغوں کو معیار قرار دے کر ادب کی نئی چیز کی تکا بوٹی فرما دیتے اِن بزرگ کو آخر ایک منچلے مل ہی گئے اور ایک دفعہ یوں بات چیت ہوئی۔

بزرگ ادب پرور نے پہلے تو اوپر والا جملہ جپ دیا اور فرمایا۔

"اچھا جو جدت کی جاتی ہے وہ سبحان اللہ زبان کی ٹانگ توڑ دی جاتی ہے۔ مسلمات ادب کے خلاف، ذوق سلیم کا خون کر کے بے سر و پا باتیں کہی جاتی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صاحب ہم نے جدت کی۔"

منچلے بولے "قبلہ آپ جدت کے بھی طالب ہیں اور جدت کی جائے تو آپ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، بگڑ جاتے ہیں۔ اور محض اس لئے کہ جن پرانے اہل قلم حضرات کو آپ بڑا مانتے ہیں آج کل کی جدت اسلوب اور خیال میں ان بزرگواروں کے رنگ ڈھنگ سے جدا ہوتی ہے۔"

ہنس کے فرمایا "مغالطہ تو یہی ہے ادب کے پرانے اولوالعزم ارباب نے جو کارنامہ چھوڑا ہے وہ ابدالاجواب اور مسلمات سے ہے اس سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے راستہ سے آپ ہٹیں گے تو یقیناً اصحاب ذوق سلیم کے نزدیک آپ گمراہ ٹھہریں گے۔"

"ہاں تو یوں فرمایئے کہ جدت کی تعریف آپ کے ذہن میں جداگانہ ہے ہر جدت آپ کے مسلمات سے جدا اور ایک نئی راہ ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر وہ بری یا اچھی ثابت ہو۔ قصہ مختصر یوں کیوں نہ فرمایئے کہ جناب والا اس قسم کی جدت سرے سے چاہتے ہی نہیں جو واقعی جدت ہو آپ محض آج کل کے فیشن کے مطابق زبان سے جدت جدت فرمانے لگے ہیں۔"

بحث مباحثہ سے کبھی کوئی بات طے نہیں پاتی اور پھر ایسے باہرکت پیٹ بھرے بزرگ کب کسی کی مانتے ہیں یہ ادبی گڑیاں کھیلنے والے بزرگ منچلے سے ناراض ہو گئے اور سنا ہے کہ اب تک برا بھلا سناتے ہیں۔

کہیں اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس بات کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ

جدت کسی تعلیم گاہ میں سکھائی نہیں جاتی اس لئے کہ کوئی اسے سکھا نہیں سکتا اس بات کو بھی ساری دنیا مانتی ہے کہ جدت کے بغیر ترقی جسے کہتے ہیں نہیں ہو سکتی ایک اور بات بھی اسی قبیل سے ہے لیکن دنیا اُسے نہیں مانتی وہ بات یہ ہے کہ جو چیز واقعی جدت کہلانے کی مستحق ہوگی وہ خواہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو اس شعبہ کی باتوں سے الگ ہوگی۔ اس شعبہ کی جانی بوجھی چیزوں سے اَنوکھی اور نرالی ہوگی۔ اور یقیناً ان چیزوں میں سے بعض کو غیر مسلمہ قرار دینے کی دعویدار ہوگی۔ اس رمز کو عام طور پر دنیا تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی نئی بات سامنے آتی ہے تو خود وہی لوگ جو ہمارے اَدبی بزرگوار کی طرح جدت کا ورد پڑھتے رہتے ہیں۔ اس جدت اور اس کے پیش کرنیوالے کو ہمارے ایک شفیق بزرگ کے قول کے مطابق ملا صلواتیں سنانے لگتے ہیں۔

اِس مضمون کا اصل مقصد یہ ہے کہ قارئین محترم کی خدمت میں جدت کرنے کا طریقہ پیش کیا جائے۔ لیکن اس طریقہ کو پیش کرنے سے پہلے اِس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ جدت سے لوگ کیوں اس قدر چراغ پا ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک امر واقعی ہے۔ یا آج کل کی اخباری اِصطلاح میں ایک ننگی حقیقت ہے کہ دنیا میں اس وقت جو کچھ انسانی تمدن کی پونجی ہے وہ اسی طرح اِکٹھی ہوئی ہے کہ پرانے دیوتاؤں کو توڑ توڑ کر نئے دیوتا برپا کئے گئے۔ اَدب کے سوا اور چیزوں سے اِس مضمون کو سروکار نہیں۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ادبی بزرگوار کی رِیش مبارک نے اپنی موجودہ وضع قطع، بے گنتی جدتوں کے بعد اِختیار کی ہے۔ اور ان کا لباس پاجامے سمیت بیشمار پرانی باتوں کے کٹنے چھٹنے اور اَنوکھی تراش خراش میں

سے گذرنے کے بعد کہیں اِس موجودہ نوبت کو پہنچا ہے اِس طرح جب انسانی زندگی کی ہر چیز مسلسل اور بے گنتی جدتوں کا پھل ہے تو پھر یہ بات غور طلب ہے کہ انسان جدت کے رجحان کا احسان ماننے کے بدلے اس کے پیچھے کیوں اِس طرح لٹھ لئے پھرتا ہے؟

انسان کی ساری خرابیوں کی جڑ تکبر ہے اپنے آپکو بڑا سمجھنا۔ اپنے آپ کو اِس مغالطہ میں ڈالے رکھنا کہ جس چیز پر میری رائے قایم ہو چکی ہے وہ قطعی ہے۔ جو بدقسمت اصحاب جدت کی لیتے ہیں ان کا گناہ کبیرہ یہ ہے کہ مسلمہ باتوں کی دنیا میں جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں یا اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں ان کی بڑائی کے مندر کو جہاں وہ اپنی بڑائی کی مورتی کی پوجا کراتے یا اپنے آپ بے غل وغش اپنی پرستش کرتے ہیں اِس مندر کو ڈھا دیتے ہیں یا ڈھانے کی دھمکی دیتے ہیں مثال کے طور پر ہمارے اَدبی بزرگوار کو ہی لیجیئے۔ وہ خیر سے مصنف بھی واقع ہوئے ہیں یعنی کتابیں بناتے ہیں۔ یا یوں کہیئے ان کا قلم کاغذ کی فضا پر اسی طرح تھرکتا اور کاوے لگاتا ہے۔ جس طرح پرانی وضع کے چابکسوار اپنے گھوڑوں کو دلہن کی طرح ٹھمکایا کرتے تھے۔ جتنی پرانی تنقیدی باتیں سینہ بسینہ یا قلم بہ قلم چلی آتی ہیں اُن کو ہی اپنے چکنے چپڑے اور گھلے گھلائے الفاظ میں بن بن اور سنور سنور کر دہرا دیتے ہیں اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ افسوس بھی فرماتے ہیں کہ اب ادبی دنیا میں جدت ہی نہیں رہی ایک دفعہ فرمایا۔

"دیکھو درد۔ میر۔ ذوق۔ مومن۔ غالب اور داغ اور . . . . ہاں یہ بزرگوار کس قدر اصحاب جدت تھے۔ ان بزرگوں نے اردو کو کس قدر نکھرا و چڑھایا ہے؟ آج کل جسے زبان کہتے ہیں قسم ہے پیدا کرنے والے کی وہ بھی کوئی زبان ہے۔ ارے صاحب کیا کہوں جو ذرا بھی جچتی ہو۔ کیوں میر صاحب کچھ کہتے نہیں"

میسر صاحب شعیرے اُن کی بڑائی کے مندر کے پجاری وہ کیا کہیں سوائے اُس کے کہ ہاں میں ہاں ملائیں۔ یہ وجہ ہے کہ جدت اور اصحابِ جدت سے دُنیا عام طور پر ناراض ہو جاتی ہے۔ جب کوئی بدنصیب ایسی کوئی جدت کر بیٹھتا ہے کہ جس سے لوگوں کی بڑائی کی کوئی مورتی لوٹ جاتی ہے تو لازمی ہے کہ بڑائی کے خوابِ خرگوش میں مست بزرگوار چونک پڑیں، بدک جائیں اور دولتیاں جھاڑنے لگیں۔ ہر جدت ترقی کی ایک سوت ہی نہیں بن سکتی بلکہ ہمارے اَدبی بزرگوار جیسے جدت نما، قدامت پسند اَصحاب کے لئے اصل خاکساری اور عجز کی بہترین تعلیم ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں کھول دیتی ہے اُن کے دماغ کو جگا دیتی ہے اور اُن کو یہ راستہ سجھاتی ہے۔ کہ کس طرح یہ گڑے مُردوں کے پجاری صحیح معنوں میں اپنے آپ کو زندہ بنا سکتے ہیں جتنے سچے قدامت پسند ہیں وہ دراصل مردہ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ ٹھیٹ اور کورے قدامت پسند نوعِ انسان کی ننانوے فی صد تعداد کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جدت پسند دماغ صدیوں کے دَوران میں دو ہاتھوں کی انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں۔ زندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کھائے پیئے بیاہا جائے اور صاحبِ اَولاد ہو جائے۔ اِتنا تو ہر جانور بھی کر ہی لیتا ہے۔ زندگی۔ اِنسانی زندگی، موت سے بالا اور موت کی دسترس سے دور ہوتی ہے۔ وہ موت پر جیت پاتی ہے اور صرف جیت ہی نہیں پاتی، بلکہ موت کو اپنی بقاء کا زبردست آلہ بناتی ہے۔ یہ کوئی فلسفیانہ نظریہ نہیں۔ واقعہ ہے ایک آدھ مثال لیجئے۔

دَرد۔ دنیوی حیثیت سے نہ تو لکھ پتی تھے اور نہ جاگیردار اور نہ عہدہ دار ایک معمولی گمنام سے آدمی تھے۔ دہلی اور نواح دہلی میں جو لوگ شعر و سخن

یا تصوف کا ذوق رکھتے تھے اُن میں اُن کا یوں ہی سا چرچا تھا۔ ایسے آدمی کو دیکھئے اور اُردو شاعری پر سکہ بٹھانے کو دیکھئے۔ میرؔ اور میرؔ کے بعد سے آج تک جتنے نامور اُستاد گزرے ہیں سب انہیں کے نام لیوا یا بغیر نام لئے اُردو شاعری کی اساسی باتوں میں انہیں کے پیرو ہیں۔

دردؔ کے بیسیوں شعر اور مصرعے اُردو زبان کے اَنمٹ اجزا بن گئے ہیں۔ اچھا اب اُن کے زمانہ کے امرا، اور ساہوکاروں کے نام ٹٹولئے سولئے چند تاریخی ناموں کے اور سب اس طرح مٹ گئے ہیں کہ گویا کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان امرا، اور ساہوکاروں کی دعوتوں اور شادیوں میں پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا ہوگا۔ اور اتنا روپیہ کہ بیچارے دردؔ نے اپنی عمر بھر میں آنکی ایک شادی کے برابر روپیہ نہ صرف کیا ہوگا۔ مگر یہ جاگیردار یہ ساہوکار ایسے مرے ہیں جیسے مَرنا کہتے ہیں۔ اُن کی اقتصاداً باا ثر ہستیوں کا کوئی واضح اثر اس ہماری زندگی پر نمایاں نہیں۔ اس کے برعکس دردؔ زندہ ہیں۔ ہم اب بھی اُن کے خیالات بولتے اور لکھتے ہیں جس ڈھرے پر اُردو شاعری کو انھوں نے لگا دیا۔ اسی پہ بیشتر چلے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں زندگی کے ہر شعبہ میں ملیں گی اور اُن پہ غور کرنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ اصلی زندگی انہیں لوگوں کی ہے جو جسمانی موت کے بعد بھی اپنی ملّت کی زندگی کا اَنمٹ حصہ بنے رہیں۔ ان لوگوں کے دماغ زبان اور ہاتھ پیر سے کام لیتے ہیں جو جسمانی زندگی رکھتے ہیں۔ اس دنیا کی انسانی سرگرمیوں کے ہر شعبہ میں آپ یہی بات پائیں گے کہ پیشرو لوگوں میں۔ ان لوگوں میں جو آگے گئے۔ جو ہستیاں واقعی زندہ تھیں وہ جسمانی وجود کے کالعدم ہوجانے پر زمانہ کے ہاتھوں تقدس اور احترام کا رنگ قبول کرتی اور بھی چیرہ دست ہوتی جاتی ہیں اور اپنی حکومت کا سکہ ان لوگوں کی روحوں پہ

بٹھا دیتی ہیں۔ جو جسم رکھتے ہیں مگر محض اس لئے کہ ان مردہ زندوں کے ارادہ اور اشارے پر ان کے جسم اور ان کے نفوس کٹ پتلیوں کی طرح ناچیں حقیقت حال تو یہ ہے لیکن ان کٹ پتلیوں کی طرح ناچنے والے زندوں نے لطیفہ یہ کیا ہے کہ انتہائی بے بسی اور لاچاری کے اظہار کے لئے کہاوت یہ گھڑی ہے۔

"مردہ بدست زندہ"

اس کی بعینہ یہ مثال ہے کہ ایک بچہ خود تو باوا کی گود میں ہو اور کہے یہ کہ "آہا ابا ہماری گود میں ہیں۔ ذرا زیادہ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہم مردہ بدست زندہ جس حالت کے متعلق کہتے ہیں خود اس وقت بھی محض زندہ جسم والے مردہ زندوں کے احکام کے مطابق ہی بے جان جسم کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ یہ مجال نہیں کہ مردہ جسم کے ساتھ بھی اپنی مرضی کے مطابق سلوک کر سکیں اس پہلو سے "مردہ بدست زندہ" کی کہاوت اور بھی کھلی کھلی اور جھوٹ پر مبنی نظر آتی ہے۔

اس دنیا میں ہر طرف مردوں کا راج ہے۔ جسمانی موت کے بعد جسم کی کمزوریوں اور لغزشوں سے پنڈ چھڑا کر زور دار مردے اور بھی کھل کھیلتے ہیں زندگی میں اس مدت میں جب تک جسم روح کی بوجھل بیڑی بنا رہتا ہے بڑے بڑے لوگوں سے بھی ایسی حرکتیں سرزد ہو سکتی ہیں کہ آس پاس والے ان کو اپنا سا کمزور سمجھنے لگیں۔ لیکن جسم کی قید سے آزاد ہو کر پھر کوئی آنکھ ان زبردست ہستیوں کی کسی لغزش سے دوچار نہیں ہو سکتی اور لوگوں کے تخیل میں مرور زمانہ کے ساتھ ایک ایسا تصور بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے جس کو کسی کمزوری کی لغزش کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جیسا کہ کہیں عرض کیا گیا ہے بڑے لوگوں کی جسمانی موت ان کی عظمت اور بزرگی کا ایک زبردست منبع بن جاتی ہے۔

اور جسم کی قید سے آزاد ہو کر زندہ اصحاب بیدردی کے ساتھ خود اپنی موت کو اپنی جبری حکومت۔ اپنے اِستبداد کی ایک زبردست تلوار بنا لیتے ہیں جس کی دَھار پر زمانہ کا بہاؤ اور سان چڑھاتا جاتا ہے اور جسم کی حد تک زندہ لوگوں کی آزادی کی جڑیں اور آسانی سے کٹتی جاتی ہیں۔

جدت کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ اُن مردہ زندوں کے اِستبداد سے نجات حاصل کی جائے جو لوگ محدود معنوں میں زندہ ہیں یعنی جو صرف جسم کی حد تک جان رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کی چاہیتی مَن بَسِی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح وسیع تر زندگی حاصل ہو۔ بہت کم کیا بلکہ خال خال ہی آدمی اِس رَمز کو سمجھتے ہیں کہ ایسی زندگی، سچ مچ اپنی زندگی اُسی وقت ہاتھ آ سکتی ہے کہ اپنی رُوح کو رفتگاں کی ہٹ دھرمیوں اور چیرہ دستیوں سے آزاد کیا جائے کیونکہ یہ ظاہر اسبک ران ساحل محض دکھاوے کے غیر موجود ہیں دراصل وہ ہماری رُوح اور ہمارے نفس پر ہماری کل ہستی پر تسمہ پاؤں کی طرح سوار ہیں۔ چونکہ یہ رُوح سوار حضرات دکھائی نہیں دیتے اِس لئے یہ اور بھی خطرناک ہیں اور موت کے ڈراونے آنکس سے ہماری روحوں کو جدھر چاہتے ہیں لئے جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے راستہ سے بال برابر بھی بھٹکنے نہیں دیتے۔

اس ارضی زندگی کے دوران میں اِنسان اِنسان سے خواہ وہ انگریزی کیوں نہ ہوں ہر طرح کی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ بہت سے آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو انگریزی کی تعلیم پا کر بھی یورپ سے مرعوب نہیں ہیں۔ اسی طرح بعض ایسی ہستیاں بھی نکل آئیں گی جو پُرانی تعلیم کے باوجود عربوں یا یونانیوں کے رعب داب میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب بھی کسی نہ کسی پہلو سے مردہ زندوں کے حلقہ بگوش ضرور رہیں۔ پُوری آزادی ان آنکھ سے چھپی ارواح سے کسی کو

نصیب نہیں ہوتی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ پوری آزادی نہ سہی تھوڑی بہت بعض چیدہ حضرات ہر زمانہ میں حاصل کر لیتے ہیں اور اسی حد تک زندہ بن جاتے ہیں۔ یہ بات ایک کلیہ قرار دی جا سکتی ہے کہ جو جسم والی روحیں بقاء کی طالب ہیں اُن کے لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے بزرگانِ پیش رفتہ کے استبداد سے اپنے آپ کو نکالیں اور ایک دن خود جسم کی جھول اتار کر مُردہ زندوں پر اپنا راج بٹھائیں دنیا کی ترقی کا راز یہی ہے۔ اور جی نی اَس کی صحیح تعریف اور نشانی یہی ہے کہ وہ مردہ زندوں کا جوا اپنی گردن پر سے اُتار پھینکے۔ اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کرلے۔

اَب سوال یہ ہے کہ اس نازک آزادی کے پانے کا کوئی طریقہ بھی ہے یا نہیں؟ موجودہ مدارس دنیا بھر میں اس آزادی کی تعلیم اور تربیت کہاں الٹی یہ بات نہایت زور شور سے سکھاتے ہیں کہ کس طرح ان زندگانِ پیشین کا اور غلام اور کنونڈا بننا چاہیئے۔ جس ملک کا نظام تعلیمی اِس قسم کی ظاہرا پُر لطف غلامی زیادہ سعیٔ وطنی کے سانڈ سکھائے گا وہ قوم دنیا میں اور قوموں سے زیادہ نکمی اور اَور قوموں کی ہر طرح دست نگر ہو جائیگی جن قوموں کا نظام تعلیمی جدت کا کم دشمن ہوگا وہ قومیں یقیناً دنیا کی زیادہ سر بر آوردہ اور فرمانروا قومیں بن جائیں گی۔

مردوں کا راج پھیلانے اور قایم کرنے میں اس مطالعہ نے بہت زیادہ مدد دی ہے جسے تاریخ کہتے ہیں جس ڈھنگ اور رنگ سے اِس مطالعہ کے متعلق کتابیں لکھی جاتی ہیں اس رنگ نے لوگوں میں یہ پس بھرا رجحان پیدا کر دیا ہے کہ لوگ مستقبل کی طرف پیٹھ کرکے ماضی کے چہرہ پر اپنی آنکھیں گڑو دیتے ہیں۔ اس رجحان کو ـــــ اِس غلط اسپرٹ کی ترقی کی دوڑ میں، پچھڑی اقوام

بہت ذوق شوق سے پالتی پوستی ہیں۔ اور سائنٹیفک مطالعہ سے اس طرح بدکتی ہیں جس طرح بعض گھوڑے اپنے پرچھائیں ہی سے چراغ پا ہو جاتے ہیں آگے بڑھنے والی قومیں اس قسم کے مطالعہ کو ترجیح دیتی ہیں اور تاریخ کو بھی اس رنگ ڈھنگ سے لکھتی پڑھتی ہیں۔ یعنی وہ تاریخ کو بھی اس پہلو سے کارآمد سمجھتی ہیں کہ اگلے وقتوں کے لوگوں نے جس طرح بعد مرون بھی اپنا اثر قایم کیا ہے اُسی طرح یہ بھی جسم کی حوالات سے چھوٹ کر دنیا پر اپنا سکہ بٹھائیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئیے کہ جس طرح ماضی کے مختلف عہدوں میں اصحاب جدت نے نئی نئی باتیں پیدا کیں اسی طرح اب بھی جہاں تک ممکن ہو نئی نئی باتیں نکالی جائیں کیونکہ مطالعۂ تاریخ کا صحیح مدعا یہی ہے کہ مُردہ زندوں کی جان ڈالنے والی جدتوں کی کامیابیاں تاریخ پیش کرے اور موجودہ مطالعہ کرنے والوں کو جدت پر اُبھارے ـــــ اُن کو یہ دکھائے کہ محض صاحب جسم ہونا اعلیٰ زندگی نہیں ہے انسان کی زندگی کو موت سے بالاتر اور غیر محدود ہونا چاہیئے۔

یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جدت کی صلاحیت جیسا کہ لوگ اب تک مانتے چلے آئے ہیں خاص لوگوں میں ایک خداداد چیز ہوتی ہے یا یہ صلاحیت ہر فرد میں کم و بیش موجود ہے اور اس صلاحیت کی پرورش اور تربیت کی جا سکتی ہے۔ دوسری صورت اس راقم کی رائے میں صحیح تر معلوم دیتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں پہلی صورت بھی شامل ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر کس و ناکس میں یہ صلاحیت موجود ہے تو یہ بات اس امر کے تسلیم کر لینے میں مانع نہیں ہے کہ یہ صلاحیت بدرجہ اتم خاص لوگوں میں خداداد ہوتی ہے۔ ہر شخص میں یہ صلاحیت اپنی بساط بھر موجود ہوتی ہے۔ جن قوموں کا رجحان ترقی کی طرف ہوتا ہے اُن میں جدت کی قدرشناسی بہت زیادہ

پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں ایک چیز کی قدر کی جانے لگے تو ظاہر ہے کہ اُن کے ہاں اِس چیز کو اُبھرنے پھولنے پھلنے کا ہر طرح موقع دیا جائے گا یہی سبب ہے کہ پیش لو ر د قومیں زیادہ مردم خیز سمجھی جاتی ہیں۔ اِس لئے کہ ہر ضرورت اور ہر شعبہ کے لئے ان کے ہاں کام کے آدمیوں کی کمی نہیں ہوتی اگر پسماندی قوموں میں ایک اندھوں میں کانا راجہ، بزرگوں میں جا ملے تو پھر اُس کی جگہ لینے کو چراغ لیکر ڈھونڈھنے پر بھی کوئی آدمی نہیں ملتا۔

اوپر جو استدلال گزرا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جدت کرنے کی پہلی اٹل شرط یہ ہے کہ اگلے بڑے لوگ جو کچھ کر گئے ہیں اُس کو آنکھیں بند کر کے تسلیم نہ کیا جائے یہ نہ سمجھا جائے کہ بس جو کچھ کرنا تھا وہ یہ بزرگ ہستیاں کر گئیں۔ اَب ہمیں صرف اُن کہنے کو مُردہ بزرگوں کے خیالات کے مطابق کٹ پتلیوں کی طرح ناچنا چاہیئے۔ جدّت پسندی کی ترنگ جس دماغ میں سمائے اُس کے لئے سب سے پہلی اور کٹھن منزل یہ ہے کہ وہ نہایت خلوص قلب کے ساتھ زندہ مردوں کے اِستبداد سے اپنی رُوح اپنے دماغ اور اپنے جسم کو آزاد کرے اِس بات پر ٹھنڈے دِل سے آمادہ ہو جائے کہ اُن زندگان کی ہر بات کے خلاف سوچ سکے اور سوچنے کے بعد علی الاعلان بزرگوں کی مسلمہ باتوں کے خلاف بولنے لکھنے اور عمل کرنے پر تل جائے۔ جدت کرنے کا اصلی راز اور مشق کی پہلی سیڑھی یہی ہے۔ اور چونکہ ترقی بغیر جدّت کے محض اَفیونیوں کا خواب ہے لہٰذا اگر ترقی کرنی ہے تو ہر شخص اور ہر قوم کو اپنے ہاں کے زندہ مردگاں سے آزادی حاصل کرنی اور اپنے آپ کو محض کٹ پتلیوں کی حیثیت سے نکالکر ایک جیتی جاگتی اپنے برتے پر سوچتی ساچتی رُوح یا روحوں کا گروہ بنانا ضروری ہے۔

انسانی تمدن کے کسی شعبہ کا مطالعہ کیجئے جس عہد کے متعلق آپ کو یہ خیال ہو کہ اسے ترقی کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اسباب ترقی پر غور فرمائیے ترقی کا راز آپ یہی پائیں گے کہ اس عہد کے لوگ اپنے بزرگ رفتگاں کے کنو نڈے نہیں ہیں۔ بلکہ صرف اس بات میں اُن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان بزرگوں کی طرح مرنے کے بعد اپنی آیندہ پود پر اپنی حکومت بٹھائیں۔

صاحب جدت دماغ ——— وہ دماغ جو اپنے آپ کو قدامت پسندی یعنی بزرگان رفتہ کے استبداد سے نکال چکا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے ہی اپنی طرح کے جسم اور روح والوں کو محض کٹ پتلیاں بنا لیتا ہے اور اپنے ارادہ کے تاروں سے جس طرح چاہتا ہے نچاتا ہے لیکن ستم تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد یہ اور بھی بلائے بے درمان کی طرح چھا جاتا ہے۔ اس کی جسمانی زندگی تو ایک حدِ معین ہوتی ہے۔ لیکن اس مرنے کے بعد کی زندگی کی کوئی حد نہیں۔ بعض زندہ مردے جو بہت ہی زوردار واقع ہوئے ہیں۔ صدہا سال سے چھائے ہوئے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب اُن کا دور دورہ ختم ہوگا۔

اُوپر جو استدلال پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں اَدب اُردو پر نظر ڈالنی مقصود ہے کیونکہ اُردو اَدب میں اور بھی بولنے والی دُنیا کی زندگی کے اور شعبوں کی طرح مردوں کا راج ۔ نہیں۔ مردوں کا استبداد اس حد تک ہے کہ جو لوگ زندہ ہیں اُن کی زبان اور اُن کا قلم بزرگ رفتگان کی محض نفیری بنے ہوئے ہیں۔ جو لفظ، جو خیال اُردو زبان والے زندہ لوگ سوچتے ہیں وہ اُن مردہ چیرہ دستوں کی شان اور سند کے بغیر معرض اظہار میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں کا ہر شاعر اور انشا پرداز جب تک اپنے دماغ میں ان زبردست رُوحوں کی

گونج نہ سُن لے اس کی نہ زبان کھلتی ہے اور نہ اس کا قلم اُٹھتا ہے۔

ہمارا اُردو ادب مُردوں کی ایک چھاونی ہے۔ جہاں یہ عجیب پُر لطف بات ہے کہ جو جسم نہیں رکھتے وہ زندہ ہیں اور صاحبِ جسم زندہ لوگوں کے دل و دماغ اور جسم کے ذریعہ اپنی فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اگر اُردو ادب کو ترقی ہونی ہے تو لازمی ہے کہ ہمارے قلوب اور نفوس پر سے اُس مُردوں کی چھاونی کو اُٹھایا جائے اور جو جسم والے اربابِ قلم ہیں وہ دراصل زندہ بن جائیں۔ محض رفتگاں کی نفیری نہ رہیں۔ اُردو نثر کی اوّل تو بساط ہی کیا۔ اور پھر اس نثر کی ابتدا حسنِ اتفاق سے اردو شاعری کی طرح مردوں کے استبداد میں نہیں ہوئی۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اور زمانہ کے بدلتے تیوروں نے اردو نثر کو بہت کچھ بچا لیا۔ لیکن ادب کی جان شاعری ہے اور نثر کی زبان کی لطافت کا معیار بھی وہی زبان فطری طور پر ہو سکتی تھی جس سے اُردو شعرا کام لے رہے تھے۔ اس طرح اردو نثر بھی۔ جہاں تک ادب کے ظاہری پہلو یعنی الفاظ کا تعلق ہے ان اثرات سے نہیں بچ سکی جنھوں نے اُردو شاعری کو محض ماضی کی گونج بنا رکھا تھا۔

زمانہ کسی چیز کو ایک حال پر نہیں رہنے دیتا۔ اردو شاعری بھی اُن اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی جو اردو دان دنیا میں اساسی اور دور رس اثرات پیدا کر رہے تھے۔ اور اُردو نثر کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق اُردو شاعری سے زیادہ وسیع اور آزادانہ آب و ہوا میں ارتقاد سے رہے تھے۔ چنانچہ اُردو شاعری بھی ——— وہ کی وہ نہ رہ سکی جو حاؔلی، اکبرؔ سے پہلے تھی اور جس پر دہلی اور لکھنؤ کو اس قدر ناز تھا کہ ان نامور اور اَمِٹ اُستادوں کی زبان کو اب تک دہلی اور لکھنؤ میں ٹکسالی نہیں سمجھا جاتا۔

ان نئی روشنی کے شعرا نے بھی ایک حد تک ہی مُردوں کے راج سے

نجات حاصل کی تھی۔ ان کی زبان بشیتر وہی تھی جو دہلی و لکھنو کے اہلِ زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ خیالات کی تازگی اور انوکھے پن میں بھی صرف اُس حد تک تبدیلی جائز رکھی کہ شاعری کو وقت کی ضرورتوں اور بہاؤ سے روشناس کرایا۔ پُرانے سانچوں میں ہی نئی رُوح ڈھالنی چاہی اس تحریک کا ایک بڑا فائدہ اُردو ادب کو یہ ہوا کہ محض خالی خولی لفظوں کی ڈھٹ بندی اور ہتھکنڈوں سے اُردو شاعری کو نجات دِلوائی لیکن یہ جو کچھ اصلاح ہوئی پوری آزادی —— سچے اَدبی سوراج کی ایک ناکافی قسط تھی جس سے اصلی آزادی اتنی ہی دُور ہے جتنی برطانوی حکومت کی سیاسی اصلاحات کی قسطوں سے ہندوستانی سوراج کالے کوسوں پرے ہے۔

آزادی خواہ زندگی کے کسی شعبہ میں ہو مردوں کے اِستبداد سے نکلنے کا نام ہے۔ بادی النظر میں یہ کلیہ دلیرانہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی صداقت ذرا سے غور سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اِس بدنصیب ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مسئلہ کو لیجئے۔ ظاہرا تو یہ واقعہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان پر ایک پردیسی قوم سوار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ پردیسی قوم ہم پر کیوں سوار ہے؟ اِس کا اَصلی جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم پر مُردوں کا راج ایسی روایات عقاید اور رسومات کی صورت میں مسلط ہے۔ جو بدقسمتی سے اصلی قومی (نیشنل) اتحاد سے ایسا بیر رکھتی ہیں۔ جس طرح آگ کو پانی سے ہے۔

غرض یہ دکھلانا مقصود ہے کہ صحیح آزادی یہ ہے کہ دل و دماغ کو رفتگان کی جبری حکومت سے جہاں تک ہو سکے رہائی دلوائی جائے اور ہندوستانیوں کی زندگی کے جن جن شعبوں میں اِس قسم کی آزادی جس حد تک نمودار ہوگی وہاں اور اُسی حد تک ہندوستانی اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ زبان اُردو

ہندوستان میں مختلف لوگوں کے میل کھانے کا پھل ہے۔ اور یہی ایک ایسی ٹیسی زبان ہے جس کو ہندوستان کی بہت بڑی آبادی بولتی اور سمجھتی ہے اور اسی کو ہندوستانی بولی کا لقب زیب دیتا ہے۔

اُردو بولنے والی دنیا کا یہ کتنا بڑا اور شاندار کارنامہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اپنی بولی کو ہندوستان کی ملکہ بنا دیں۔ اس کو ادائے خیال کا ایسا ہتھیار بنا دیں کہ سارا ہندوستان اس کا لوہا مان جائے اور اِس طرح ہندوستانی اتحاد کا ایک زبردست ستون برپا کر دیں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اُردو ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے اِس قابل ہو جائے کہ اس کی لطافت عمدگی اور وسعت لوگوں کو مجبور کر دے کہ وہ اُردو کو اپنی عام دیسی زبان بنالیں اس طرح کی وسعت اور لطافت اُس وقت پیدا ہوگی کہ اُردو ادب جدت سے لبریز ہو جائے۔ اُس کے اربابِ قلم محض مُردوں کی نفیری نہ رہیں۔ بلکہ اپنی جدتوں سے اس اپنے ادب کو مالا مال کر دیں۔ حسین اور کار آمد نفیس اور ہمہ گیر کر دکھائیں۔

جدت کرنے کا طریقہ اس مضمون میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ رفتگان پیشینی کے جوئے کو رُوح اور گردن پر سے اتارا جائے۔ اور اس کی بہترین صورت اور پہلی سیڑھی یہی ہے کہ پرانے خیالات جو ہم پر چھائے ہوئے ہیں اُن کے خلاف سوچنے کی عادت ڈالی جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر پرانی بات کے خلاف سوچیں اُس پر دفعتہً عمل پیرا بھی ہو جائیں۔ عمل اپنے آپ ہونے لگتا ہے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آپ اِخلاص ہمدردی اور صداقت سے سوچنے لگیں۔ پرانی روایات یعنی اپنے دِل و دماغ والی رفتگان کی آواز کی گونج سے سہمیں نہیں۔

اِس موقع پر اُردو ادب کے ظاہری پہلو کے متعلق چند ایسی باتیں جو بزرگوں سے چلی آتی ہیں اور جن کے آگے بڑے بڑے زندہ اَرباب خاموشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں پیش کی جاتی ہیں۔ اِن باتوں کے خلاف اِستدلال بھی نذر کیا جائے گا۔ ہمارے رگ و ریشہ اور دل و دماغ میں جو بزرگ فرمانروا ہیں اُن سے ڈر ہی لگتا ہے۔ لیکن اور کچھ نہیں —— یعنی حضرات قارئین اُن کو مانیں نہیں محض بطور تفنن طبع اُن کو ملاحظہ فرما جائیں۔

سب سے پہلی چیز جو اُردو کے پھیلنے کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اُس کا چھاپہ بہترین حسین اور سستا ہو جائے۔ اُردو میں ایسے روزناموں اور رسالوں کی سستی اشاعت ناممکن ہے۔ جو جلد سے جلد اور باتصویر شایع ہو سکیں۔ یا جن میں فن نقاشی اور فن طباعت کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جا سکیں یہ ساری خرابی اِس وجہ سے ہے کہ اُردو دان دنیا کی سمجھ پر پتھر کے چھاپہ نے پتھر ڈال دیئے ہیں۔ یہ دقیانوسی چھاپہ اردو کے گلے کا طوق بنا ہوا ہے۔ اس سے نجات اسی طرح مل سکتی ہے کہ متحرک ٹائپ کا چھاپہ اُردو کے لیئے فراہم کیا جائے جو رسم خط اردو دان دنیا نے انتخاب کر رکھا ہے اس کی خاص شان یہ ہے کہ وہ متحرک ٹائپ کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ یا کم از کم اب تک تو نستعلیق نے یہ صورت اِس طرح اختیار نہیں کی ہے کہ ٹائپ خوبصورت ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ کوئی عالی دماغ اس کڈھب نستعلیق کی شان کو باقی رکھ کر اس کا ایسا متحرک ٹائپ بنائے جس میں جوڑ کم ہوں اور جو سستے داموں بازار میں آسکے۔ ایسی ایجاد کی توقع ایک مسلمانوں جیسی مفلس اور غیر مردم خیز قوم سے کرنا ظلم ہے۔ جس قوم میں اب تک غزل جیسی بے معنی بے تسلسل صنفِ سخن میں قابل لوگ مغز پاشی فرمائیں اور سنجیدہ لوگ اِن مغز پاشیوں کی آپے سے باہر ہو ہو کر داد دیں اس قوم سے کسی معقول ایجاد کی توقع

واقعی ایک صریح ظلم اور ناانصافی کی بات ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کم سے کم چھاپہ کی حد تک نسخ کا ٹائپ اختیار کر لیا جائے۔ نستعلیق دراصل ایران کی جدت طرازی ہے۔ لیکن ایرانیوں نے چھاپہ میں اس اپنے رسم خط کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ہم اُردو والے نہ جانیں کیوں اس خط کے ایرانیوں سے زیادہ دلدادہ ہیں۔ کہ اس کو آنکھوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ نسخ اپنی مقدس زبان عربی کا رسم خط ہے۔ اور مذہبی پہلو سے ہمارے دلوں کو ہلا دینے والا کوئی اعتراض پیدا نہیں ہو سکتا۔

اَب رہی تیسری صورت۔ اس کے سننے کو سنبھل جائیے۔ اور اپنے اندر والے مردہ زندوں کو بھی قابو میں رکھنے کی کوشش فرمائیے۔

اس وقت انگلستان اور امریکہ نے چھاپہ خانہ میں بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ اور روز نئی نئی سہولتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہاں اخبار و رسالوں اور کتابوں کی نفاست عمدگی اور ارزانی پر رشک آتا ہے۔ کیوں ہم یہ نہ کریں کہ انگریزی چھاپہ کا رسم خط اُردو کے لئے اختیار کر لیں اور نرا اختیار ہی نہ کریں بلکہ اس میں جو نقائص ہیں اُن سے پرہیز کریں اپنے ہاں کے حروف ہجا کی بے ضرورت تعداد کو کم کر دیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو اس انگریزی چھاپہ کے حروف کو صوتیات اور اپنی لسانی ضرورتوں کی روشنی میں ایک مکمل نظام حروف بنالیں۔ اس کے بعد یورپ کی طباعت کے متعلق کل ایجادوں اور سامان سے ہم اسی طرح فائدہ اُٹھا سکیں گے جس طرح اس وقت موٹر کی خریداری سے لطف اور فائدہ ہم اُٹھا سکتے ہیں۔ اُردو ادب اور صحافت میں ایک زبردست انقلاب ہو جائے گا اور بہت سے جھمیلے قضیے اور جھگڑے یک لخت مٹ جائیں گے۔

رسم خط کے بدل دینے سے زبان نہیں بدلتی فرانسیسی اور انگریزی چھاپہ کے

حروف ایک ہی ہیں. لیکن جو لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ وہ فرانیسی کے ایک لفظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے اسی طرح نستعلیق ایرانی رسم خط ہے محض اردو جاننے والے فارسی کی ایک سطر بھی ٹھیک نہیں پڑھ سکتے. سمجھنا تو بہت بڑی بات ہے غرض اردو کے ہوا خواہوں کے غور فرمانے کے لئے یہ بھی ایک پر لطف مسئلہ ہے کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہمارے معزز قارئین ان مسائل پر اس طرح غور فرمائینگے کہ بزرگ رفتگاں کی اندر والی آواز کو استدلال میں کھنڈت نہ ڈالنے دیں۔

اردو نثر اور نظم۔ خصوصاً نظم کے متعلق بہت سی باتیں غور کے لایق ہیں۔ اور ان پر پُر لطف بحثیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان میدانوں میں بھی جدت کی بیحد گنجائش اور ضرورت ہے۔ یہ مضمون شیطان کی آنت ہو چکا ہے اس لئے اس کو اور طول دینا مناسب نہیں علاوہ اس کے اردو شاعری کے متعلق ایسی باتیں جن کو ایک حد تک جدت کہہ سکتے ہیں رسالہ اردو اورنگ آباد دکن میں یہ آپ کا خادم لکھ بھی چکا ان کا محض دُہرانا بھی ٹھیک نہیں۔

بات یہ ہے کہ اب اردو ادب کی ترقی نری قدامت پسندی اور الٹ پھیر کر پرانی باتوں کو دُہرانے سے نہیں ہوگی۔ بڑی ضرورت اردو کی دنیا کو ایسے دماغوں کی ہے جو نڈر ہوں اور واقعی اپنے برتے پر سوچتے ہوں جب تک خیال کو آزادی نڈر پن پیدا نہ ہوگا ممکن نہیں کہ اردو ادبیات میں ترقی ہو۔ خیال کا بہاؤ زبان کی ظاہری تبدیلیاں اپنے آپ کر دیتا ہے۔ اور پرانی باتوں کے دلدادہ حضرات چیختے کے چیختے رہ جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ابھی اردو بولنے والے نوجوان بے سہارا نہیں سوچ سکتے نئی راہوں پر قدم رکھتے گھبراتے ہیں۔ مُردہ زندوں کی آواز سے سہم جاتے ہیں۔ اور اس طرح گو وہ بلحاظ سن و سال اور شکل و شمائل جوان سمجھے جائیں لیکن دراصل وہ کبر سن ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ بزرگ

مُردوں کی محض نفیری ہوتے ہیں۔ بڑھنے والی قوموں میں جوان اور یہی قماش کے ہوتے ہیں۔ وہ نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ اپنی زندگیاں جدتوں کے پیچھے وقف کر دیتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جو لوگ نئی پود کو تعلیم دے رہے ہیں اُن کا بڑا فرض یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو صحیح معنوں میں جوان طبیعت بنائیں۔ اسی طرح اُردو صحافت کا بڑا فرض یہ ہے کہ جدّت پسند دماغوں کو چراغ لیکر ڈھونڈھے اور اُن کی حوصلہ اُفزائی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر جدت اچھی یا کارآمد نہ ہوگی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر پرانی چیز بھی ہمیشہ کے لئے اچھی اور کارآمد نہیں ہو سکتی۔ ترقی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ جدّتیں ٹِڈی دل کی طرح اُردو دنیا میں اُمڈیں تنقید اُن کو پرکھے موافق اور مخالف اِستدلال اِخلاص مندی یا غیر اخلاص مندی کے ساتھ اُن کو جانچے۔ نثر اور نظم میں نئے نئے تجربے کئے جائیں۔ قدامت پسند بزرگ رفتگان کی زبان بن کر غل مچائیں اور جدت پسند اپنے آپ کو زندہ بنانے کی ترنگ میں اپنی سی کئے جائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ پود اِس مردانہ راستہ پر چلنے کا حوصلہ رکھتی ہے یا نہیں؟ —— اپنے آپ کو مُردہ زندوں کے اِستبداد سے آزاد کر سکتی ہے یا نہیں؟

اٹوائی کھٹوائی

ظرافت جسدِ اجتماعی[1] میں برق کی طرح ساری ہے روزمرہ کے تعلقات و معاملات ہوں جن کو آئے دن کی مزاولت پھیکا کر دیتی ہے یا تاریخ کے عہد نوح والے انقلابات ہوں جو طبقاتِ اجتماعی کو طوفانِ ارتقاء میں غرق کر دیتے ہیں، ظرافت کی قوتِ لطیفہ سے معمور ہوتے ہیں۔ قوتِ برقی کے اکتشافاتِ علمی کے لئے، حالانکہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سے خالی نہیں، گلبرٹ اور فرانکلن کی تیز نظر کی محتاجی تھی اسی طرح ظرافت کے نقرئی تبسم کی جھلک دکھانے کے لئے شکسپیر اور مولیئر، غالب اور اکبر کی عمیق نظر اور ہنسی سے لبریز چتونوں کی ضرورت ہے۔ ایسی نظر جس کسی خوش نصیب کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہو اس کے گنگا جمنی تیر تصور کے تیتری جیسے نفیس پروں پر اڑتے اور نمکِ ظرافت میں ڈوبے ہوئے انسان اور اس کے معاملاتِ اجتماعی کو لطیفہ خیز نشانہ بناتے ہی ہیں، مگر ستم ظریفی یہ کہ شیخ سماء اللہ ہی کو بخشتے ہیں نہ لالہ دھرتی رام کو۔ چنانچہ غالب کی یہ شوخی ملاحظہ ہو ؎

زندگی اپنی جو اس طور سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

[1] Social Body

ظرافت کی دیوی کا اصلی جولانگاہ میدان اجتماعی ہے اور جماعت کیا ہے؟ ایک عجیب حیرتناک گورکھ دھندا ہے۔ جماعت کے افراد پر نظر دوڑائیے۔ لکھو کھاڈاکٹروں ہزاروں وباؤں اور جنگ عظیم یورپ کے باوجود بھی آدم و حوا کی نافرمانی کے پھل کو محض شمار کرنے کے لئے عمر نوح درکار ہے۔ کاش ہر نافرمانی کا پھل ایسا بابرکت ہوا کرتا۔ سطحی نظر کو الگ رکھئے اور ذرا گہرے جائیے تو پھر ہر شخص کے سینہ میں ایک ظاہرہ تو ننھے سے پھدکتے حضرت دل ہیں اور ہر انسان کے کاسۂ سر کے گوشۂ تنہائی میں یوں دیکھنے میں ایک معصوم نما دماغ ہے۔ لیکن ایک میں اَن گنت جذبات ہیں جن کا تلاطم سمندروں کے طوفانوں کو گرد کر دے اور دوسرے کے احاطۂ خیال میں وہ وسعت کہ ساری کائنات سما جائے۔ اس پر لطف مزید یہ کہ ہر شخص اس تمام غیر محدود ظاہری اور باطنی گوناگونی کو لئے ہوئے ایک دوسرے سے اجتماعی ڈوریوں سے گتھا ہوا ہے۔ میاں بیوی سے وصل، بچہ ماں باپ سے ملحق۔ ایک خاندان دوسرے سے پیوند اور اسی طرح خیال دوڑاتے جائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عالم انسانیت کا ہر فرد عالمگیر اجتماعی جال میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ تصوف کی ترنگ میں آکر لاکھ دنیا ترک کرے، راہب اور سنیاسی بنے، اس پھندے سے چھٹکارا صرف موت کا جانگیر ناخن ہی دلوا سکتا ہے۔

نظریۂ ارتقا کا فرمان ہے کہ اس جماعت کے اُلجھاوے کو یوں ہی سلجھا سکتے ہیں کہ جماعت کو ایک جسد علایق مانا جائے۔ اور یہ یاد رہے کہ نظریۂ ارتقاء کا عالم خیال میں وہی رتبہ ہے جو بین الاقوامی اکھاڑے میں پریزیڈنٹ ولسن کا ہے۔ ارتقاء کے منجملہ کئی چودہ نکات کے ایک نکتہ، جس سے جسد علایق کے مفہوم کی گرہ کشائی ہوتی ہے یہ ہے کہ مرد اور اُس کا نازک ضمیمہ علیحدہ علیحدہ

سے ہیں لیکن محبت کا لگاؤ اور جذبات کی کیمیا ان دو کو ایک کر دیتے ہیں اور اس طرح جسدِ اجتماعی کا پہلا بیج بوتے ہیں۔ اس پہلے بیج یا باصطلاح عام خاندان کو تھوڑی دیر کے لئے ہی تخیلاتِ اجتماعی سے الگ کر دیجئے اور جماعت کی ساری عالمگیر عمارت ڈھے جاتی ہے۔ لہذا صرف یہ کہنا جیسا کہ انگریزی مثل ہے کہ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔ سچ ہے مگر سچائی کا ایک بٹہ کڑوا رواں حصہ بھی نہیں گھر عالم کون و فساد کی جڑ ہے، ارتقاءِ اجتماعی[1] کی نہ بند ہونے والی سوت ہے، حریت اور غلامی کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے، ہوم رول، اور استبداد کی بنیاد یہاں پڑتی ہے اور وہیں سے ملکِ معظم کی سال گرہ شروع ہوتی ہے اور مہاتما جی کا ستیا گرہ۔

مردوں کی خوش قسمتی ہی سمجھئے کہ موزونی عادت، زیست کے شور و شغب اور صنفِ نازک کے اطاعت نما اقتدار کی وجہ سے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کہاں تک شمعی انگلیوں کے مطیع و منقاد ہیں اور کس حد تک دنیا کے واقعات چھوٹے ہوں یا بڑے، تاریخی ہوں یا غیر تاریخی، حوّا کی دخترانِ کمزور و بے بس کے لب شہد آگیں اور ابرو خمدار کی ذرا سی حرکت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مرد جب بہت ڈون کی لینے لگتا ہے اور اپنی بڑائی یا فوقیت بہت جتلانے لگتا ہے تو ظرافت کی دیوی اصلیت کی جھلک دم بھر دکھا دیتی ہے۔ انگلستان کے مغرور اور حریت کے فدائی مرد بھی سایہ کی اطاعت سے بچ نہیں سکتے۔ رہا ہندوستان یہاں تو سرے سے حریت ہی عنقا ہے لہذا ایک طرف ساڑی دیوی بنکے تو جا کر اسے اور دوسری طرف، کھڑے یا بیٹھے اپنی ایڑی پر بیعت لیں تو کون اچنبھے کی بات ہے مگر یہ ظرافت خیز کرشمہ دیکھئے کہ ہندوستانی حریت سے اتنے ہی دور ہیں جتنے مرکب حضرت عیسیٰؑ کے سر سے سینگ اس پر ہندوستانیوں کا دعوےٰ ہے کہ

---

(1) Social Evolution

ہماری گھونگھٹ والیاں بالکل ہمارے زیرِ نگیں ہیں۔ انگریز تو نرے زیرِ سایا یا جیسی کہ انگریزی اِصطلاح ہے "مرغی ٹھنگیائے" ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کھلی بات ہے کہ یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ وہ تو یوں کہیئے کہ پردہ نے پردہ ڈھانک رکھا ہے۔ کسی کو یقین نہ آئے تو لسان غیب حضرت اکبر یا آنریبل مرزا زن مرید بیگ اور لالہ استری داس سے پوچھ دیکھئے۔ جب دو آدمیوں میں اِنتہائی میل جول اور دلبستگی کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ بھئی فلاں اور فلاں ایک جان اور دو قالب ہیں۔ مرد اور مرد کے گہرے تعلقات تک اس طرح کہنا بجا ہے۔ لیکن گھر جب علایق ہے وہاں اِتحاد اصلی اس امر کا متقاضی ہے کہ ایک جان اور ایک قالب ہو۔ بغیر ایسے اِتصال اور قربت کے نہ اِنسان تخلیق کی زبردست اِرتقائی قوۃ میں حصّہ لے سکتا ہے نہ جماعت کا ظاہری ڈھانچ باقی رہ سکتا ہے۔ میاں بیوی کے بارے میں ایک جان اور ایک قالب کہنا سطحی نظر سے شاید اوپری سا معلوم ہو۔ لیکن فلسفہ اجتماع کی چلبلاپائی شعاعوں کی روشنی میں، میاں اور اس کا مسرت زاضمیمہ اس صورت میں بھی کہ اس یکجائی اور یکجہتی کے باعث اور ننھی ننھی ڈالیاں بھی۔ ایک یا بہت سی، گودمیں پھوٹ نکلی ہوں، ایک جان اور ایک قالب ہی نظر آئیں گے۔

دولھا میاں اپنے نازک بوجھ کو پالکی میں سے اُٹھا کر مکان میں لاتے ہیں دل ہے کہ پھولے نہیں سماتا، اور تصور ہے کہ اپنے دلفریب جھروکے دفعتہً کھول دیتا ہے اور دولھا میاں کو سبز باغ دکھاتا ہے۔ بیچارے دولہ میاں کو فہم عامہ اور عقل سلیم کی سنجیدہ مگر دبی زبان کی آواز جذبات کے نقار خانہ میں کہاں سنائی دیتی ہے۔ وہ کب اس قدر حواس فراہم کر سکتے ہیں کہ اُس نازنین بے زباں کے دلکش بھولے بھالے خدوخال میں اپنی آئندہ حکمراں کا گمان بھی دل میں

لاسکیں۔

لڑکے کی ماں بھی یوں تو چہرہ پہ باچھیں کھلائے پڑی پھرتی ہیں اور کیوں نہ کھلائیں "میرے اللہ آمین کے بچے کا گھر آباد ہوا"؟ مگر عورت ذات کو خوب سمجھتی ہے۔ ساس کی کھلی ہوئی باچھوں کے پیچھے دل ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرح آئندہ یقینی "ہوم رول" کی شورش سے سہما جاتا ہے۔ مردوں کو نہایت شکر گذار ہونا چاہیئے کہ ارتقار اجتماعی نے ساس کے فرائض کی انجام دہی اُن کے تفویض نہیں کی۔ مرد ساسوں کو ہی اگر بہوؤں کو بھرنا پڑتا تو نہ جانے اُن کی کیا گت بنتی۔

بڑی آرزوئیں تھیں ماں باپ کو، عزیز اقربا کو، اور دوست احباب کو مسٹر ینگ ہز بینڈ (   ) کے ٹھنڈے دل کو کوئی شعلہ رُخسار گرما دے اور گرجا تک لیجائے اور میاں شباب خاں کے لئے اُن کے ماں باپ کوئی اَن دیکھی گھونگھٹ والی ڈھونڈھ نکالیں اور اپنے جیتے جی دو بول پڑھا دیں اور بچہ کا سہرہ دیکھ لیں۔ لیجئے شادی بھی رچی اور "ماہ عسل[1]" اور چوتھا چالا بھی ہو چکا اور اَب جو دیکھا تو ماں باپ، عزیز اقربا اور دوست اَحباب حیران ہیں کہ ماہ عسل، اور چالوں کے عہد مسرت عہد میں نہ جانے کیا طلسم تھا، کیا اجتماعی اکسیر تھی کہ نہ مسٹر ینگ ہز بینڈ، ینگ ہز بینڈ رہے، اور نہ شباب خاں، شباب خاں۔ جسے نازک ضمیمہ سمجھے ہوئے تھے وہ دبنہ کے وبال جان دنبالہ کی طرح بوجھل ہوتا جاتا ہے اور اس کے پھیلاؤ میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جاتی ہے۔

مگر مرد بھی آخر ماں کا ہی بیٹا ہوتا ہے۔ ساڑھی کی حکومت آسانی سے تو قبول نہیں کر سکتا۔ اکثر خاوند تو پہلی ہی رات موم کی ناک بن جاتے ہیں۔ بعض چند سے

---

[1] Honey Moon

مدافعت کرتے ہیں مگر پہلا زچہ خانہ اُن کی ترکی تمام کر دیتا ہے، معدودے چند جنگی شخصیت نسائیت سے زیادہ ترلبریز ہو کچھ برابر سرا بر کا مقابلہ کر لیتے ہیں اور صلح و جنگ میں عمر تیر کر دیتے ہیں۔ خال خال ایسے بھی ہیں کہ ترکی بہ ترکی مقابلہ کرتے ہیں اور مردانہ وار دم واپسین تک اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ الوائی کھٹوائی کے عجیب ہتھیار کو سمجھنے کے لئے ایسے گھر کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہے۔

قبل اس کے کہ ہم الوائی کھٹوائی کی توضیح کو لے بیٹھیں۔ ایک عام غلطی کو دور کر دینا لازمی سمجھتے ہیں۔ فن تعلیم پر بڑے بڑے فلسفیوں نے خامہ فرسائی کی ہے ہر قسم کی درسگاہوں کے منافع اور مضرتوں پر روشنی ڈالنے میں نفسیات کی بال کی کھال کھینچی ہے۔ اس ناچیز راقم کی رائے میں کانٹ اور اسپنسر معاف فرمائیں سبھوں نے کشاکش حیات کی اصلی درسگاہ کو چھوا تک نہیں اور وہ درسگاہ مسہری ہے۔ خیر اسپنسر تو ایک بڑی حد تک قابل معافی ہے کہ اس بیچارے نے اس مکتب شبینہ کے دو ذرہ اور شہد بھرے پر وہ لیکچر سنے ہی نہیں۔ لیکن جو اس لطیف درسگاہِ خلوت میں تعلیم و تربیت پا چکے ہوں جن کے دل و دماغ پر ہر سبق بوسہ ہائے شیریں اور مزید ار چٹکیوں کے ساتھ مرتسم کیا گیا ہو، اُن کا اس درسگاہ راز و نیاز کے تذکرہ سے پہلو تہی کرنا کس قدر کفران نعمت اور احسان ناشناسی ہے۔

لگے ہاتھوں ایک اور عام مغالطہ کو دور کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ سیاسیات میں اس امر کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ارتقائے دولت (State) کے طول طویل دوران میں سے اُلٹے پیروں، اگر آپ استدلال تاریخی کے عصا کے سہارے تخم اولین دولت، کی چھان بین کریں تو آپ تمام اشکال دولت میں سے گزرتے مسہری پر جا ٹکیں گے۔ لیکن اس سیاسی اصول مسلمہ کے باوجود بھی انگلستان

کی مجلس شورے کو "مجالس شوریٰ کی اماں جان" کہا جاتا ہے۔ منطق اس مغالطہ پر نہ مسکرائے تو کیا کرے جبکہ اس کی اٹل اونگلی بتا رہی ہے کہ اگر مجالس شوریٰ کی ماں کو ڈھونڈھتے ہو تو سات سمندر پار دریائے ٹیمز کے کنارے اس جستجو میں جانے کی حاجت نہیں وہ سامنے تمہاری دارالمسرت، عالم انسانیت کی سب میں پہلی مجلس شوریٰ، تمہاری مسہری بچھی ہے۔ ارتقائے سیاسی کے سارے اصول اساسی اس ننھی سی دولت "مسہری" میں مضمر ہیں۔ خانہ جنگی کو پھیلا دیجئے تو سیاسی شورش یا انقلاب ہوجاتا ہے۔ بیگم صاحبہ کی اٹوائی کھٹوائی کو قومی پیمانہ پر تصور کیجئے تو مہاتما جی کا ستیاگرہ بنجاتا ہے۔

اچھا اب ہم اٹوائی کھٹوائی کو لیتے ہیں۔ میاں شباب خاں کی دلھن آئیں ساس نے بہو کی چٹ چٹ بلائیں لیں۔ کیا کرتیں مجبور تھیں۔ مسہری کی مجلس شوریٰ کے مباحث و منازل طے کرنے کے لئے بیٹے اور بہو کو دو بدو چھوڑنا پڑا۔ جی تو یہی چاہتا کہ ایسی بہو بیاہ لائیں جو بیٹے کی دلھن کہلائے مگر مسہری کے پارلیمنٹ سے کوری رہے۔ مگر یہ ناممکن۔ اچھا بیٹے کی شادی کیونکر نہ کرتیں۔ اس کے گھر کا آباد ہونا، اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کو گودوں کھلانا بھی بیچاری بڑی بی کا اب رہا سہا ارمان تھا۔ غرض صبر و شکر کرکے رات کاٹی۔ اپنی بیاہی اور ان بیاہی بیٹیوں اور مصاحب خاص بی مغلانی سے حملہ اور مدافعت کا مشورہ کیا صبح ہی گربہ کشتن روز اول، کے کارگر اصول پر پیش قدمی شروع کردی۔ ساس نندوں نے نئی دلھن بے زبان، شرمیلی کو کوری صراحی کی طرح اندر باہر سے ٹھونک بجاکر دیکھنا شروع کردیا۔ جس طرح کسی جدت پسند مصنف کی تازہ تصنیف پر، وہ خود ساختہ اہل قلم اور نقاد جو ویسی کتاب نہیں لکھ سکتے اور یقین رکھتے ہیں کہ اس تازہ تصنیف سے ان کے عامیانہ مضامین اور تصنیفات طاق نسیاں کی آرائش

بن جائیں گی۔ نئی تصنیف پر تنقیدی مضامین کے پرے کے پرے توڑ دیتے ہیں
اُسی طرح ساس نندوں نے سر سے لیکر پیر تک نئی دلھن کے کسی عضو نازک کی
ساخت حرکت اور ادا کو نہیں چھوڑا۔

ساس نے ایسے موقع پر کہ بہو کی میکے والی ماما اچھی طرح سن لے کہا "میرے
شباب کو جیسی چاہیئے ویسی صورت نہیں ملی۔ دلھن کا چہرہ طباق سا ہے۔ نام کو
نزاکت نہیں (ٹھنڈا سانس لے کر) مردوا پن پڑا ٹپکتا ہے بوا لاکھ جتن کئے
کہ اچھی صورت والی ملے مگر تقدیر میں جو لکھا ہو وہ ہو پھر ہو۔"

ایک اور موقع پر بڑی نند نے اس احتیاط سے کہ بھاوج بھی سن سکیں
یوں پھول جھاڑے:-

"چلو بی مغلانی! کوئی میرے شہاب کے رنگ کو لے کر کیا چاٹے۔ وہی
اماں جان کی کہاوت کہ طباق سا چہرہ چنے کی دال کی سی ناک، دو پوتھئیں آنکھوں
کی جگہ یہ بھی کوئی آدمی کی صورت ٹھیری۔ تم نے تو میری نند نور جہاں کو دیکھا ہے
خدا لگتی کہنا۔ ماشاء اللہ جو دیکھتا ہے نظر لگتی ہے۔ عورت ذات کی آنکھ ناک ا
ہی دیکھی جاتی ہے۔ لاکھ اماں جان سے سر مارا نند کے لئے اُن کو یہی آرزو تھی کہ
"نا بوا۔ میں آمنے سامنے کی شادی کر کے کیا اپنا سفید چونڈا مونڈواؤں گی۔"

چھوٹی نند مکھولی ابھی جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں میں قدم
رکھنے والی تھی۔ الھڑپن باقی تھا، ایسے موقع پر بول اُٹھی کہ بھاوج بھی سنے
اور بھائی بھی۔

"اے ہے۔ اماں جان۔ بھابی جان کا نچلا دھڑ چلنے میں کیسا مٹکتا ہے
عَین مَین چُنیا بَطخ چلی جاتی ہے۔"

ساس نے دیکھا کہ میاں شباب خاں نے بھی سنا ہوگا چیخیں۔ "چُپ لنگا! او

زبان چلانی سیکھی ہے۔ ابھی کنوارپنے میں یہ حال ہے۔ اپنے بڑوں کو نام دھرتی ہے۔ بڑی بھاوج ماں کی جگہ۔ آج اس کو چنیا بطخ بنایا کل مجھے کڑک مرغی کا خطاب دیگی۔"
بڑی بی اس بوکھلاہٹ میں کہ کہیں بیٹا یہ نہ سمجھے کہ میرے اشارے سے بہن کہہ رہی ہے۔ اپنے آپ پر پھبتی کس گئیں۔ بی مکھولی کی ہنسی کا عالم کس سے بیان ہو سکے۔

غرض اعلان جنگ ہو گیا۔ ابتدائی گولہ باری بھی ہو گئی۔ باقاعدہ شباب دلھن پر ساس نندوں کے گراپ۔ بالراست اور بالواسطہ چلنے لگے۔ بالواسطہ آواز پھینکنے میں گھونگھٹ والی دنیا کی فطرۃ میں خاص ملکہ ہوتا ہے۔ انسان حیوان یا بیجان کسی پر رکھ کر نشانہ لگانا اور ایسا نشانہ کہ خطا نہ کرے۔ صرف صنف نازک کے ہی دماغ اور زبان سے ہو سکتا ہے۔ جب ساس بہو سے خوب گھمسان کی ہونے لگی تو ایک دن ساس نے مرغی پر رکھ کر یہ آواز کسا۔ یہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ بالواسطہ گولہ باری کے لطف اور لطافت کو ضبط تحریر کرنا مردوں کی بساط سے باہر ہے۔ شباب دلھن کئی دن سے بالاخانہ سے نیچے نہیں اتری تھیں۔ ایک دن آئیں ساس کو سلام کیا اور ساس نے 'بیٹا ہو' کی رسمی دعا دی اور بی مغلانی سے بولیں "آے بیے۔ سچ کہتی ہو۔ دیکھو تو نگوڑی مرغی کی بے حیائی کو۔ جہاں دیکھو مرغے کے پٹھوں میں گھسی رہتی ہے۔ دم بھر پنڈ نہیں چھوڑتی۔" بی مغلانی کو اپنی نفیس منطق پر ناز تھا بولیں۔

"آج کل کا زمانہ ہی ایسا ہے۔ سچ ہے چودھویں صدی ہے۔ موئے جانوروں تک میں شرم نہیں رہی۔ آج کل کی لڑکیوں کا تو کیا ذکر۔"

۱ اقتدار کی چاٹ بھی بڑی بلا ہے۔ دنیا کے خون خرابے خانہ جنگی، شورش اور انقلاب تقریباً کل کے کل اقتدار کی ہوس کا نتیجہ ہیں۔ نہ گورنمنٹ آف انڈیا اقتدار

کو ہاتھ سے دینا پسند فرما سکتی ہے نہ کوئی ساس گھر کا کارخانہ خوشی سے بہو کے سپرد کرتی ہے۔ شباب دلہن کی ساس اپنی ساس کے مقابلہ میں بڑی کامیابی حاصل کر چکی تھیں اور اقتدار پسندی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی تھی۔ گھر کا پتّا بھی بغیر اُن کے حکم کے ہل سکتا تھا نہ کوئی تنکا بغیر ان کے اشارے کے سرک سکتا تھا۔ اُن کے سرتاج پرانی وضع کے اور وہ بھی مرنجان مرنج طبیعت کے تھے۔ شادی سے قبل بیچارے اپنی والدہ کے زیرنگیں تھے چونکہ گھر سے پانچے کی اطاعت کے عادی تو ہو ہی گئے تھے بیوی ایسی تند مزاج، اقتدار پسند اور خوبصورت، بیچارے ایسے پگھلے کہ بیوی نے جس سانچے میں ڈھالا ڈھل گئے۔ ماں سے زیادہ بیوی ہو گئیں آئے دن کی چھیڑ چھاڑ اور پردہ لکچروں کی نوک جھوک اور ساس بہو کی اَن بن سے دق ہو کر چین اسی میں دیکھا کہ بیوی کے آگے بلا شرط ہتھیار ڈالدیں۔ رہیں اماں جان " وہ بیچاری تتری بتری ہو گئیں گھر کے جھمیلے اُن کے بس کے نہیں۔ بیگم کا سلیقہ ایسا کہ ہزاروں میں ایک۔" شباب دلھن، ساس کی بدقسمتی، ایک پڑھی لکھی اور اُس پر دانشمند بہو ملی۔ ابتدائی یورشوں میں خاموشی اختیار کی جو خود ایک طرح کا غضب انگیز جواب تھا پھر رفتہ رفتہ اپنی ماما کے منہ سے چھبتے ہوئے جوابی حملے شروع کر دیئے۔ اِدہر میاں شباب خاں کے پرجوش دل پر اپنی محبت اور چاہت کی ریشمی ڈوریوں کا جال ڈالنے لگی۔ جب ذرا یقین ہوا کہ پھندا مضبوط ہے تو بسم اللہ کرکے آزمایش کا تہیہ کیا۔ شباب خاں ایک دن نہایت مزے میں تھے۔ خوش خوش آئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ لیا۔ اور لب پر بوسہ ثبت کرکے بولے " میری چندے آفتاب وچندے مہتاب " شباب دلہن نے دلربایانہ ٹھنک سے منہ میاں کے ہاتھوں میں سے ہٹالیا اور کہا " طباق سے چہرے کو آپ کیا پیار کرتے ہیں " گلے میں باہیں ڈالکر شباب خاں بولے " کس کی مجال ہے۔ تمہارے چہرے کو طباق سا کہے "

"اے ہے۔ بس بیٹے میرا دم گھٹا۔ سارا گھر یہی کہتا ہے" شباب خاں سمجھ گئے کہ سارا گھر سوائے ساس کے اور کون ہو سکتا ہے۔ اس طرح بہو آہستہ آہستہ میاں کو اپنی مدافعت اور حملہ کا زبردست مورچہ بنانے لگی۔ ایک ستم اور کیا۔ شباب خاں کے والد جیسا عموماً خسر صاحبان کا دستور ہے بہو کو بہت چاہتے تھے۔ فطرۃً باپ بیٹے کے کارنامہ پہ نازاں ہوا کرتا ہے۔ اور جس طرح بیٹے کی بی۔ اے کی سند قابل ناز ہوتی ہے بیٹے کی بیوی بھی اُس کے نزدیک ایک سند ہوتی ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ شباب دلھن کے خسر روز صبح کو تسبیح ہلاتے، وظیفہ پڑھتے بہو کے پاس بالاخانہ پر آتے اور کیوں بیٹی اچھی ہو" کا مقررہ جملہ فرما کر ذرا کی ذرا اکڑوں ٹکتے ہوئے پان لیا اور یہ جا وہ جا۔ بہو نے رفتہ رفتہ خسر سے شرم توڑی اور اُن کے مزاج کو تاڑنے لگی۔ اپنی خوش سلیقگی اور سعادت مندی کا سکہ اس درجہ اُن کے دل پر بٹھا دیا کہ بڑے میاں بہو کا کلمہ پڑھنے لگے۔ ایک تو گھر سے پانچے کی اطاعت کی نادرشاہی دور سے کچھ ملگت سی پڑ گئی تھی اور اس سپکے کو بیوی کے نادرشاہی عہد نے اور بھی راسخ کر دیا تھا اوس پر بہو جو اُن کے آرام و آسائش کی تدابیر کرتیں سر میں تیل ڈالتیں، کپڑے سی دیتیں، اپنے ہاتھ سے طرح طرح کے پکوان تیار کر کے کھلاتیں اور کہہ دیتیں "ابّا جان! خاص آپ کے لئے پکایا ہے" گو پکاتیں شباب خاں کے لئے، تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ قبلہ بیوی کے استبداد سے گھبرائے ہوئے تو تھے ہی بہو کے زبردست طرفدار اور حامی بن گئے۔ ساس پہلے تو بڑے میاں کو بہو کے ہتے چڑھتے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھیں اور اس قدر اپنے اقتدار پر گھمنڈ تھا کہ بڑے میاں کی مخالفت کا گمان بھی نہ آسکتا تھا۔ وہ اکثر اپنے سوم کی ناک، بڑے میاں سے بہت پیار ہیں آتیں تو کہہ دیا کرتی تھیں۔

"اللہ میاں نے مجھے تو تمھارا میاں بنایا ہوتا" بڑے میاں ٹھنڈا سانس

لیکر کہہ دیتیے " ہاں صاحب وہاں بھی چوک ہوگئی۔ مگر یوں بھی تمھارا بگڑا ہی کیا ہے"
لیکن ساس بہو کی خانہ جنگی جوں جوں اِرتقاء پانے لگی اور بڑے میاں ایک آدھ
بار بی مغلانی اور ماما پر بہو کی طرف سے برس پڑے تو اب تو ساس کے کان
کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے بڑے میاں کو راہ راست پر لانے اور "ایاز
قدرِ خود بشناس" کا سبق دینے کا تہیہ کر لیا۔ ساس شباب دُلھن کو "تمھاری چاہتی
بہو" کے لقب سے بڑے میاں کے آگے یاد کرتیں۔ کسی کام کو کہتے تو جواب ملتا
" اپنی چاہتی بہو سے نہیں کہتے " کسی بات میں کچھ مشورہ دیتے تو جھلا کر چیخ
اُٹھتیں " بس بس یہاں کوئی نہیں سُنتا۔ اپنی چاہتی بہو سے کہیئے۔ آپ کی عقل
کی وہی قائل ہیں " چاہتی بہو نے دیکھا کہ زہر چڑھتا جاتا ہے۔ بڑے میاں کے
مدت کے سوئے ہوئے ارادے کو جگانا شروع کیا۔ فطرت نے صنفِ نازک میں یہ عجیب
قوۃ مقناطیسی ودیعت کی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو مرد کے بہترین جذبات وخیالات
کو اُبھار سکتی ہیں اور اُن سے کام لے سکتی ہیں۔ جوبن کے اُبھار کے دِنوں
میں اِس قوت کا شباب ہوتا ہے۔ شباب دُلھن نے بڑے میاں کو طرح طرح سے
اِس کا احساس پیدا کرا دیا کہ دراصل اُس گھر کے سیہ وسفید کے مالک وہ خود ہیں
اُن کی "نصف بہتر"⁽¹⁾ نے اُن کے جائز حقوق غصب کر لئے ہیں۔ کبھی بڑے میاں
جلی کٹی سنکر بہو کے پاس آتے تو کہتے " بیٹا! تیری ساس بڑی بد مزاج ہے"
بہو جواب دیتیں " ابا جان آپ اُن کو ناحق الزام دیتے ہیں۔ آپ بد مزاجی
سہتے ہیں۔ تو وہ بھی بد مزاجی کرتی ہیں " بہو کبھی سسرے کو گھر کی بد نظمی اور بی
مغلانی اور ماماؤں کا لُوٹ لُوٹ کر کھانا سمجھاتیں تو بڑے میاں لمبا سانس لیکر
کہتے " میری تو اِس گھر میں پیش نہیں جاتی۔ اَب گھر ویران ہو تو میری بلا سے "

(1) Better-half.

بہو نہایت شیریں نثروں میں فرماتیں " واہ آپ بھی کیا کہتے ہیں۔ خدا آپ کو رکھے رہتی دنیا تک آپ کے جیتے جی اس گھر میں کسی اور کی چل سکتی ہے۔ وہ تو یوں کہیئے کہ آپ ہی نے ڈھیلی رسی چھوڑ رکھی ہے آپ کبھی ٹھان لیں تو بھلا کس کی آپ کے سامنے چل سکتی ہے "

شباب دلہن نے خسر کے ارادے کی سوتی بھیڑ کو جگا دیا تھا لیکن اس کی توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی حسب منشا اثرات ظہور پذیر ہونگے۔ بہو کی ماما آفت کی پرکالا تھی۔ بی مغلانی کا بس چلتا تو اس کی کچی بوٹیاں چبا جاتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ساس کے اشارے اور اپنے بغض للّٰہی کی وجہ سے بہو کی ماما سے چھیڑ چھاڑ کرتیں اور اس کو عین بڑی بیگم صاحبہ کی وفاداری اور اپنا بڑا کارنامہ تصوّر کرتیں۔ بی مغلانی نے ایک دن عجیب کچوکا دیا۔ بہو کی ماما تھی خاصی آدمی کی سی صورت اور بہ تقاضائے احساس، صورت ذرا بنی سنوری اور صاف ستھری بھی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے شباب دلھن کا دیا ہوا ایک بہار کا جوڑا پہنا اور سنگھار بھی احتیاط سے کیا تھا۔ بی مغلانی نے جو دیکھا جل کے کوئلہ ہوگئیں اور سر سے پیر تک دیکھ دیکھ کر منہ پر ہی بول اٹھیں۔

" او ہو سنگھار کی بہار دیکھنا۔ کہیں شباب دولھا کو رجھا کر بیوی کی چھاتی پر مونگ نہ دلنا " زبان عورت کا زبردست اوزار ہے مگر بعض اوقات بے قابو ہو جاتی ہے ساری جلن یہ تھی کہ بی مغلانی نے اپنی بیٹی کے لئے شباب دلھن سے منہ پھوڑ کر ایک جوڑا مانگا تھا۔ شباب دلھن اور مغلانی سے سلوک! شباب دلھن نے ٹال دیا اور جلانے کے لئے اپنی ماما کو ایک اچھا جوڑا دیا۔ مغلانی نے جو دیکھا تو تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اور سچ غصہ میں کہاں سلامت رہتی ہے جو منہ میں آیا ہانک گئیں۔ بہو کی ماما اس خاص آوازے پر تو کچھ ایسی

جلی بھنی نہیں بلکہ کچھ دل میں اترانے ہی لگی کہ میری بھی صورت ایسی ہے مگر موقع پاتے
ہی بی مغلانی پر وہ حملہ کیا جس کے لئے بہت دنوں سے موقع تاک رہی تھی۔

"واہ بی مغلانی۔ اپنی ہائی اوروں پر گنوائی۔ تم نے کیا بڑی بیگم کی چھاتی پر مونگ
دلی اور ان کو بھی اپنا سا سمجھنے لگیں۔ بڑے سرکار پر بڑی بیگم سے شادی کے پہلے ہی نے
ہی تو ڈورے ڈالے تھے اب بڑی پارسا بنی ہے مصلے پر سے سرکتی نہیں گلے میں
تسبیح ڈالکر اوروں کو بیسوا بناتی ہے"۔ سچ اور جھوٹ کی خبر تو بی مغلانی کو ہو یا بڑے
سرکار کو مگر مشہور یہی تھا کہ بڑے سرکار نے شادی سے پہلے بطور مشغلۂ بیکاری بی
مغلانی سے ذرا سی دلگی کرلی تھی۔ شباب دلھن کی ساس کو بھی یہ احوال معلوم تھا مگر
اپنی ساس کے مقابلہ میں بی مغلانی کو اپنا طرفدار پایا اور اس کی زبان کو کارآمد ہتھیار
سمجھ کر اور یہ بھی بھانپ کر کہ میاں مٹھی میں رہیں گے ذرا سی دلگی سے درگذر
کر گئیں تھیں۔ ورنہ بی مغلانی کا طبقات الارض میں تو کہیں پتہ نہ چلتا۔ بی مغلانی
کو اپنی وفاداری پر ناز تھا اور بڑی بیگم ناز برداری بھی کرتی تھیں اور بڑے سرکار
بھی شاید قدامت کا لحاظ کرتے تھے۔ غرض بی مغلانی ایک چیز تھیں اور ان کی
زبان ایک منجھا ہوا ہتھیار تھی جس کی مشق ماماؤں پر ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔

بی مغلانی نے بہو کی ماما کا جواب جو سنا۔ اور آپے سے باہر ہوگئیں اور کچھ
جواب بن نہیں پڑا تو ایک تڑاق سے طمانچہ لگا دیا۔ "لے مجھ پر تہمت دھرنے کا مزہ
چکھ"۔ بہو کی ماما نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "لے ہاتھ چلانے کا تماشہ دیکھ۔ اری
آج دلھن بیوی سے تجھے کھڑے کھڑے نہ نکلوایا ہو تو میرا نام پلٹ دیجیو"۔ بہو کی
ماما جوان تھیری اور تھپڑ کچھ پیار سے تو لگایا نہیں تھا۔ مغلانی بلبلا اٹھی رہے سہے
اوسان بھی غصہ میں رخصت ہوئے پھر ان کی مشاق للو کہاں قابو میں رہتی۔

"دلھن بیوی کی بچی۔ دلھن بیوی سے نکلوائے گی اری تجھ کو اور تیری

دلھن بیوی کو اس گھر سے خوار کر کے نہ نکلوایا ہو تو میرا نام مغلانی نہیں"
وقت کی بات غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ زبان تو بے قابو ہو ہی گئی تھی حافظہ بھی غصہ کی گرمی میں بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ اتنا بھی دھیان نہیں رہا کہ بڑے سرکار پاخانے میں بیٹھے ہیں۔ بڑے سرکار نے ایک ایک لفظ سُنا۔ بہو نے بہت کچھ مرد بھی بنا دیا تھا اس پر مغلانی نے بات اتنی بڑی کہی۔ طیش کی لہریں تن بدن میں دَوڑ گئیں یوں یہ بات نہ سُنتے تو آدھے پَون گھنٹے اور فکرِ سخن کرتے بیٹھے رَہتے مگر جلدی سے باہر نکل آئے۔ بڑی بیگم نے مدّت سے بڑے میاں کو طیش میں نہیں دیکھا تھا۔ چہرہ سُرخ لال مرچ کی طرح، گرد داڑھی کے بال چنور کی طرح بکھرے ہوئے۔ بدن موٹر کی طرح تھر تھر آتا ہوا "اری نمک حرام بدلگام مغلانی ابھی نکل" کی زور سے چیخ ماری اور اُونچے سُروں میں بہت کچھ گل فشانی کی اور اڑ گئے "ابھی کھڑے کھڑے گھر کے باہر کروں گا۔ دیکھوں (بیوی کی طرف گھور کر) کون تجھے روک سکتا ہے" بڑی بی سکتہ کے عالم میں تھیں اپنے موم کی ناک میاں کے سینے میں اس قدر طیش کے وجود کا انھیں اب سان گمان تک نہیں رہا تھا۔ طیش میں مرد کی شان صنفِ نازک کے لئے دلفریب ہوتی ہے۔ بعض مردانہ شان کی قدردان بیویاں جان بُوجھ کر مرد کو طیش دلاتی ہیں کہ بھپرے شیر کی شان کے مزے لیں۔
پہلے تو بڑی بی دم بخود سی رہیں۔ پھر ہمت کر کے دبکی ہوئی بولیں۔
"صاحب مغلانی سے آخر کیا گناہ ...."
"بس چپ رہو خیر اِسی میں ہے۔ گناہ ہوا" اور اِس طرح دیدے بدل کر دیکھا کہ بڑی بی کی ساری بدمزاجی حلق تک آ کر رہ گئی۔ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ بہو بھی نیچے آ گئیں تھیں ڈریں کہ کچھ کہوں اور میاں بھپرے ہوئے ہیں آخر مرد ذات ہیں کچھ کہہ بیٹھیں تو بہو کے سامنے کیسی کِرکری ہو۔ بہو پر دل ہی دل میں کچیاں

باندھیں۔ خوب جان گئی تھیں کہ بہو بھی آفت ہی کی بنی ہوئی ہے۔ مجھ جیسی بیوی
سے بڑے میاں کو باغی کرایا تو اسی نے مگر کہہ کیا سکتی تھیں۔ بہو سے بولیں۔
"بیٹی دیکھتی ہو۔ تمہارے ابا جان کو کیا ہو گیا ہے۔ آپے سے باہر ہیں مغلانی
سے اگر قصور ہوا ہے نکال باہر کریں۔ حال سے بے حال کیوں ہوئے جاتے ہیں بیٹیا
تم ہی سمجھاؤ" شاب دُلھن خسر سے بولیں "ابا جان سچ تو ہے آپ مجھ نصیبوں پھوٹی
کا اِتنا خیال کیوں کرتے ہیں۔ بی مغلانی آج کیا جب سے نئی دُلھن ہو کر آئی ہوں
یہ اور اس سے کہیں زیادہ کہہ چکی ہیں۔ رذالی سمجھ کر ٹال ٹال دیا۔ کبھی اماں جان
سے (ساس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر) آپ سے یا اُن سے کہہ دیتی تو قیامت
برپا ہو جاتی۔ یہی سمجھتی کہ ایسی ایسی اَینیا خَنیا ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔ جیسی
اوقات ویسی بات۔ چلیئے ابا جان اوپر چلیئے۔ غصہ کو تھوکیئے۔ اماں جان کی پرانی
آدمی ہیں اُن کا تو خیال کیجئے" اِس سمجھانے پر ساس جتنی خوش ہوئی ہوں گی آپ
تصور فرما سکتے ہیں۔ رہے بڑے میاں اُن کو اپنے اقتدار کا نیا احساس تھا اور
سمجھانے سے ایسے موقع پر مرد اور پھیل جاتا ہے۔ بولے۔

"بیٹیا۔ تم اِس میرے گھر کے معاملہ میں نہ بولو۔ تمہاری ساس صاحبہ نے
اِس نکمی حرام کو بہت سر چڑھایا ہے۔ میری بہو کو اس طرح کہے۔ اس کی تو چٹیا پکڑ کر گھسٹوا
نگا" ساس کے منھ تک جواب آیا۔ "بڑے آئے ہیں میرے گھر والے" میں نہ
ہوتی تو گھر کا گھروا ہا ہو جاتا۔ میری بہو، کس مزے سے کہتے ہیں جیسے یہی تو بیاہ کر لائے
ہیں۔ مجال ہے میری مغلانی کو کوئی ہاتھ تو لگائے" مگر بڑے میاں کے غیر معمولی
طیش اور بہو کی موجودگی نے کچھ کہنے نہ دیا۔ غرض بی مغلانی نکال دی گئیں جس
وقت وہ برقع اوڑھ ڈیوڑھی کے باہر قدم رکھنے ہی کو تھیں، بہو کی ماما نے جھک کر
کہا "خالہ مغلانی سلام"

شباب دُلھن نے سوچا گھڑی گھڑی ایسا موقع ملنا مشکل ہے۔ گرم لوہے کو ہی پیٹا جاتا ہے۔ غرض ہر پہلو پر غور کر کے طے کیا کہ اٹوائی کھٹوائی لے لینی چاہیئے دوپہر کا کھانا ماما پھیر لائی "بڑی بیگم دُلھن بیوی تو نہیں کھاتیں اُنھوں نے اٹوائی کھٹوائی لے لی ہے" بڑی بیگم غصہ اور پریشانی میں بولیں "میری سغلانی کو نکلوا کر کلیجہ میں ٹھنڈک نہیں پڑی کیا اب میرا منھ یہاں سے کالا کرائے گی" بہو کی ماما بولی "بیوی آپ تو ناحق بہو پر طوفان لیتی ہیں سغلانی کا منھ کالا کیا۔ بڑے سرکار نے اُن کو کہیئے" بس ساس اب آئیں تو جائیں کہاں۔ قطامہ کہکر جو فضیحتہ کیا تو سات پشت تو کیا مال ہے سد ہا پشت الٹ کر رکھدی۔ ماما شباب دُلھن کے پاس روتی ہوئی آئی اور "نا بیوی! میرا اِس گھر میں ٹھکانا نہیں۔ تمھاری ساس تو پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑی ہیں" زور سے کہا کہ نیچے بھی آواز جائے۔ اور بہو کی ماما نے اٹوائی کھٹوائی شباب دُلھن کی تقلید میں لے لی۔ ساس تھوڑی دیر تک سغلانی کے معاملہ میں شکست کھانے سے اونٹا کیں۔ بہو کی ماما کی زبان درازی پر کھولتی رہیں اور بڑے میاں کی بغاوت پر کچھ فکر مند کچھ پھولی رہیں۔ پان زردہ کھایا تو دماغ درست ہوا۔ بخار بھرا ہوا دبا۔ اور اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ بہو نے دنیا کا ہیبتناک ہتھیار اٹھایا ہے جس کے آگے بڑی سے بڑی توپ گرد ہے اور جس پر ہوائی جہاز بھی غالب نہیں آسکتا۔ ساس خود اس ہتھیار کو برت چکی تھیں اور اس کے خطروں سے واقف تھیں سوچ میں پڑی رہیں اور دیکھا تو دل ہی دل میں قائل ہونا پڑا کہ بہو نے ٹھیک موقع پر اٹوائی کھٹوائی کی ٹھانی ہے۔ ہول ہونے لگا کہ دیکھیئے بیٹے صاحب کچہری سے آئیں تو کیا گل کھلتا ہے۔ بہو کی عقلمندی کا لوہا بڑی بی دل میں مان گئیں اور یہ نہایت تکلیف دہ خیال تھا۔

شباب دُلھن، سروجنی دیوی یا مہاتما جی تو تھی نہیں کہ اٹوائی کھٹوائی کو فلسفیا

دنج پر سوچتی اور گھریلو سیاست کو ہندوستان کے حدودِ اربعہ تک پھیلا دیتی، تو بھی نری ناخواندہ بھی نہیں تھی۔ سوچ سمجھ کر اِس خاردار گھاٹی میں، اِس پل صراط پر قدم رکھا تھا۔ اور جانتی تھی کہ ثابت قدمی ہی کامیابی کی کنجی ہو سکتی ہے۔ ۱

شباب دُلھن نے الوائی کھٹوائی کی پہلی منزل یوں شروع کی کہ فاقہ اختیار کیا۔ فاقہ سے دُو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دانہ پانی کے بند ہونے سے جو تکلیف اِنسان پر گزرتی ہے اُس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ اب خیال فرمائیے کہ ایک نازوں پلی نزاکت بھری ہستی جس کے قدموں پر شوہر دل نذر چڑھا چکا ہو کھانا نہ کھائے پانی نہ پیئے، کڑاکے کے فاقوں پر کمر باندھ لے تو دولہ میاں کے دل کا کیا حال ہو۔

دوسرا بڑا فائدہ فاقہ کا یہ ہے کہ بھوک کی آگ جب پیٹ میں دہکنے لگی ہو تو ۱ فرشتہ سیرت اِنسان بھی جھلا اُٹھتا ہے۔ بھوک کی تیزی اور اذیت سے غصہ اور شورش کی آنچ دھیمی نہیں پڑتی اور ارادہ میں لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ فاقہ کس قدر اُصولی شئے ہے۔ جو بھوک کے کچّے ہوتے ہیں وہ ارادے کے بھی پست ہوا کرتے ہیں۔ فاقہ بازی میں مرد صنفِ نازک سے بازی نہیں لیجا سکتا یہی وجہ ہے کہ آخر میں چلکر گھونگھٹ والیاں ہی ور رہتی ہیں۔

فاقہ کے ساتھ ساتھ دوسرا زبردست اُصول ہڑتال ہے۔ بیوی منہ لپیٹے اور مُنھ اوندھائے پڑی ہوں۔ سر سے کھیلیں اور نہ منھ سے بولیں تو خانہ داری آپ چوپٹ ہو گی۔ ہڑتال اصلی ہمدردی کے پیدا کرنے کا زبردست گر ہے۔ آپ کسی بات پر ناراض ہوں، صدائے اِحتجاج بلند کریں، فاقہ کی ٹھان لیں تو اوروں کو کیا۔ قہرِ درویش بجان درویش کا مضمون ہوگا۔ اوروں کے کام حسبِ دستور چلیں۔ بھوک میں کھانا ملے پیاس میں پانی اور ہر اِحتیاج بلا روک ٹوک

پوری ہوجائے تو کون آپ کے خود خواندہ درد اور تکلیف کو جیسا چاہیئے محسوس کر سکتا ہے۔ ہمدردی اُسی وقت پیدا ہوسکتی ہے کہ ہمیں ناراض کرنے والے یا ہم پر ظلم توڑنے والے بھی ہماری سی تکلیف میں مبتلا ہوں، ہماری ٹیس کے ساتھ اُن کے پہلو میں بھی ٹیس ہو۔ یہ اُسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہڑتال کردی جائے۔ خانہ داری درہم برہم ہو۔ باورچی خانہ اوندھا ہوجائے، تو پھر دولہ میاں کو معلوم ہوتا ہے کہ فاقہ کیا شئے ہے، اور نصف بہتر کی حکومت کن اقتصادی تنگین اور لازوال خواہشات اساسی پر ٹکی ہوئی ہے۔ بھوک کا ڈنک ہی بھوک کی قدر کرواسکتا ہے اور اپنی خواہشات کی رکاوٹ ہی اوروں کی خواہشات میں روڑے اٹکانے کی ناانصافی پر روشنی ڈال سکتی ہے۔ گھریلو ہڑتال میں جو سب میں زبردست پہلو ہے وہ کاروبار مسہری پر اوس کا پڑجانا ہے۔ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا بھلا بھی درست کہا گیا ہے مگر ایک نوجوان دولھا مسہری پر اکیلا لوٹتا، کس قدر اوروں کو بھلا یا برا لگتا ہے اس سے قطع نظر کیجیے، بیچارہ خود کو کس قدر قابل رشک مسرت خیز حالت میں پاتا ہوگا۔

اٹوائی کھٹوائی کا تیسرا بڑا اثر عنصر ماتم ہے۔ یوں تو گھونگھٹ والی دنیا کا ہر عضو نازک سانچے میں ڈھلا ہو یا نہ ہو، تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن آنکھیں اور وہ بھی بولتی آنکھیں جن سے آنسوؤں کی لڑیاں پڑی ڈھلکتی ہوں مردوں کے دل کے لیئے وہ کام کرتی ہیں جو مشین گن سے نہ ہوسکے۔ آنسوؤں کی بارش کے ساتھ زبان کی نفیس بجلیاں مل جائیں تو پھر مرد اور اس کے استقلال کا خدا ہی حافظ ہے۔ رونا پیٹنا اور اس کے ہمراہ منطق سے کوسوں دور رنگین مسلسل بین اچھے اچھے مردوں کے ہردے ہلا دیتا ہے۔ باقاعدہ پٹیک پٹیا اور اشکوں بھیگی صنف نازک کی آنکھوں کا نظارہ مردانہ آنکھیں برداشت نہیں کرسکتیں اور نہ مردانہ

کان سُریلے و ردبھرے لب لعلیں کے بین کو سہہ سکتے ہیں۔

چوتھا نہایت سنگین اور زود اثر و تیرہ وہ ہے جسے بیگماتی اصطلاح میں "خاندان کی ناک کٹوانا" کہتے ہیں۔ اس سے منشاء ہر گز انسان کے اُبھرے ہوئے ضروری عضو کی خونریزی نہیں ہے بلکہ سیدھی سادی اُردو میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دستور اور احکام اجتماعی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جائے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کوئی میاں اس قدر کٹر اور سنگدل واقع ہوئے کہ بیوی کے فاقہ کی خبر نہ لی، ہڑتال کی پروا نہ کی، اور آنسوؤں سے نہ پسیجے تو پھر اُن کی گھونگھٹ والی اگر پردہ نشین ہوئی، تو اعلان کر دیتی ہے "میں سر پیٹتی گھر کے باہر نکل کھڑی ہوتی ہوں اور دیکھو تمھاری کیسی ناک کٹتی ہے" بڑے بڑے سورما جو جان ہتیلی پر لئے پھرتے ہیں ناک کی دھمکی سے سہم جاتے ہیں اگر اس دھمکی سے کوئی چکنے گھڑے میاں اپنی ناک کو معرض خطر میں نہ سمجھیں تو قانونِ نکاح کو اُسی طرح پُرزے پُرزے کر دینے کا ڈراوا، جس طرح جرمنی نے صلحناموں کے ساتھ حال ہی میں سلوک کیا تھا عالمِ اجتماعی میں نہایت ہیبناک دھمکی ہے۔ مرد کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی گھونگھٹ والی کے دل کا وحدہٗ لاشریک مالک رہنا چاہتا ہے۔ صنفِ نازک اس حد سے زیادہ حس انگیز، اور پکے پھوڑے کی طرح دُکھتے مردانہ قلب کے گوشہ سے خوب واقف ہے۔

القصہ شباب خاں شام کو کچہری سے لوٹے دیوان خانہ میں اُن کے والد ماجد نے حسبِ دستور چلے سے خوش آمدید کہا "بیٹا طبیعت تو اچھی رہی" اور شباب خاں کئی گھنٹے سے بُوسہ کے بھوکے جلدی جلدی گھر میں داخل ہوئے امّاں جان تخت پر مُصلے بچھائے تسبیح لئے اللہ میاں سے لو لگائے مگر منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ شباب خاں تھے سعادت مند۔ ماں کا چہرہ دیکھکر بولے "امّاں جان

آپ کا مزاج کیسا ہے ؟" "بیٹا اچھی ہوں" "جاؤ تم کپڑے اتارو، منہ ہاتھ دھوؤ۔
دن بھر محنت کی ہے ؟" شباب خاں کو دوبارہ کہنے کی ضرورت کہاں اُوپر لپکے
بیوی اِستقبال کے لئے کھڑی ہوا کرتی تھیں۔ آج نہ وہ نہ اُن کے بوسہ طلب
لب لعلین آگے چلے۔ کمرہ میں ایک طرف منہ اوندھائے پڑی ہیں" بیگم۔
کیوں خیر تو ہے۔ مزاج کیسا ہے" کہتے ہوئے لپکے اور چاہا کہ حسب دستور اپنے
تشنہ ہونٹ آبشارِ مسرت سے لگادیں۔

"اے ہٹے۔ میری تو جان عذاب میں ڈالدی ہے اور اُوپر سے یوں ستایا
جاتا ہے" اور بیگم صاحبہ نے آنسوؤں کا تار باندھ دیا۔ صنفِ نازک کے آنسو بھی
سدھے سدھائے ہوتے ہیں ذرا سے اِشارے پر ڈھلکنے لگتے ہیں۔ آنسو تھے
کہ طوفان تھا۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ لوچ دار جسم پیچ و تاب کی تصویر تھا۔ شباب خاں
کے حواس جاتے رہے اور کچھ نہ سوجھا جلدی سے پانی کے ایک دو گھونٹ بڑی
مشکل سے حلق کے نیچے اُتروائے۔ طوفان گریہ کے ڈر کے مارے پھر بیچارے
نے نہ پوچھا کہ بات کیا ہے۔ ادھر اودھر کی بے ہنگام باتیں کیں۔ جواب نہ ملا۔ اپنے
کمرے میں جاکپڑے اُتار، منہ پر ایک آدھ چھپکا مار۔ بہن کو آواز دی۔ بہن کو شباب
خاں بہت چاہتے تھے گودوں کھلائی بہن تھی۔ اور اُس پر بھائی سے بے اِنتہا
محبّت کرتی تھی۔ بہن اٹھلاتی ہوئی اُوپر پہونچیں۔ بھائی نے سر پہ ہاتھ پھیرا
اور کہا۔

"دیکھو۔ دیکھو سچ سچ بتاؤ یہ آج ہوا کیا ہے۔ اماں جان کا منہ پھولا ہوا ہے
تمھاری بھاوج کا منہ کئی فٹ لمبا ہوگیا ہے۔ بات کیا ہے ؟"

اوّل تو بیچاری بڑی بی ایسی سٹ پٹائی ہوئی تھیں کہ بیٹی کو کوئی پٹی نہیں
پڑھائی تھی۔ دوسرے بھائی کو بی کھولی واقعی چاہتی تھیں اور صنفِ نازک

میں اگر کوئی کمزوری ہے تو بس یہی بھائی اور آگے چلکر اولاد کی محبت۔ دولہ میاں سے محبت جتلائی جاتی ہے اور وہ بیچارے اس سے زیادہ کیا توقع کرسکتے ہیں غرض بہن نے ساری داستان بے کم و کاست دُہرادی۔ جس لطیف پیرایہ میں میٹھی بے ساختہ زبان اور اُٹھتی جوانی کی سکھائی ہوئی دلفریب اداؤں کے ساتھ بی ٹکھولی نے داستان دُہرائی، اگر وہ کسی قدر دان دولہ کے آگے اِس طرح دُہرائی جاتی تو بار بار بوسوں سے داد ملتی اور شہر لی مٹھاس، کو سونے کے تار کی طرح جہاں تک ممکن ہوتا کھینچا جاتا۔ مگر شباب خاں بھائی تھا اور ہمیں طوالت کا خوف ہے۔ شباب خاں باوجود بیوی کی الوائی کھٹوائی کے، والد ماجد کے غیظ و غضب کا حال سن کر بے ساختہ ہنس پڑے اور تعجب سے پوچھا "اور اماں جان نے کچھ نہیں کہا؟" ٹکھولی نے ادھر اودھر دیکھ کر ہنسی سے لبریز چہرہ بھائی کے قریب لاکر کہا۔ "اماں جان تو گنگ سی ہوگئیں اور وہ بھی آج سچ مچ ڈر گئیں" کس قدر حیرتناک بات تھی کہ اماں جان اور ڈر جائیں! شباب خاں ہنسی نہ ضبط کرسکے۔ داستان سے بیوی قطعاً بے جرم بلکہ مظلوم ثابت ہوئیں۔ ابا جان کے غیر معمولی طیش سے یقین ہوا کہ اُنھوں نے اماں جان کی زیادتی پائی ہوگی، جب ہی تو اتنی جراءت کر گئے اور اپنا قصور دیکھا ہوگا جب ہی تو اماں جان طرح دے گئیں ورنہ بیچارے ابا جان کا نہ جانے کیا حشر ہوا ہوتا۔ بہن کو نیچے بھیج کر شباب خاں بیگم کے پاس گئے اور کہا۔

"پیاری بیگم غصہ کو تھو کیجئے۔ مجھے سب حال معلوم ہوا۔ مغلانی ٹھکرا م بدزبانی کی سزا کو پہونچی۔ اب اپنی جان کو کیوں ہلکان کرتی ہو۔ آپ ماشاء اللہ دانشمند تعلیم یافتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اتنا سُننا تھا کہ بیگم کیا تو منہ اوندھائے لیٹی تھیں یا جھٹ اُٹھ بیٹھیں غضبناک مگر دلربا لہجہ میں بولیں "سب حال سُن لیا اور پھر کیا منہ سے

کہا جاتا ہے۔ غصّہ کو تھوک دیئے: میرے اُوپر تو دن رات آرے چلیں۔ خدائی خوار
نکلے ہائیاں مجھے گھر سے خوار کر کر نکلوائیں اور آپ میرے سرتاج اِس طرح
کہیں جیسے کوئی بات نہیں (یہاں آواز بھّرانے لگی) میں اب اِس گھر میں نہ دانہ
کھاؤنگی نہ پانی پیونگی۔ اپنا خون پانی ایک کردونگی (آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی)
میرے اباجان آج جیتے ہوتے تو ایک لحظہ تو یہاں نہ رہنے دیتے۔ بن باپ کی
سمجھ کر اس بدڑے کو پہونچایا ہے۔" اب کیا تھا دھواں دھار بارش ہونے لگی۔
شباب خاں اب اٹوائی کھٹوائی کے زبردست سطمح نظر کو سمجھے۔ سوچ میں پڑ گئے۔
رات گذرنے لگی۔ نیند کیا خاک آتی۔ بیگم نے نہیں کھایا وہ کس طرح کھاتے سمجھائے
منائے کہ ایک دو نوالے کھا لیجئے مگر بے سود۔ اپنی بیوی کے بیمار ہونے کا ڈر۔
رونے دھونے سے تکلیف الگ اٹھائی۔ صبح سے دانہ پانی حرام پھول ہی نازک
ہستی اور اُس پر بیوی اور وہ بیوی جس نے دل پر قبضہ کر لیا ہو۔ رات بھر طرح طرح
کی اُدھیڑبن میں پلک کیا خاک جھپکتی صبح ہوئی تو وہی "ہنوز روز اوّل" بیچارے
نے اشکوں سے بھیگے رخسار پر ہونٹ رکھے، منت سماجت کی، ہاتھ تک
جوڑے، خودکشی کر لینے کی دھمکی دی۔ اِس دھمکی کا کیا اثر ہوتا صنفِ نازک خوب
جانتی ہے کہ مرد اِس میدان کے مرد نہیں ہوتے۔ غرض شباب خاں نے ہر طرح
سمجھایا منایا مگر وہی ایک بات "میں اِس گھر میں پانی پیوں نہ دانا کھاؤں۔ آپ
زندہ نہ جانے دیں گے تو یوں ہی فاقہ کر کر کے مرجاؤں گی تو میری لاش تو جائیگی
اور مجھ میں جان ہی کتنی ہے۔"

شباب خاں کو اور کچھ نہ سوجھی سیدھے اپنی ساس کے پاس پہونچے۔ سارا
ماجرا کہہ سُنایا۔ ساس ایسی ننھی بنیں جیسے کچھ خبر ہی نہیں۔ حالانکہ رتّی رتّی کی
خبر پہونچ چکی تھی اور اپنی بیٹی کی کشاکش حیات کی پہلی جنگ کے نتیجہ کا بے قراری سے

انتظار کر رہی تھیں۔ شباب خاں کو دیکھتے ہی تاڑ گئیں کہ فتح ہے۔ سب سنکر فرمایا۔ "میری لڑکی اس قدر صبر والی اور بے زبان تھی کہ چراغ لیکر ڈھونڈھو تو نہ ملے۔ نہ جانے اس چودھویں صدی کا کیا اثر ہے ایسی بے زبان ایسی بن جائے۔ اُس کو ساس سے ماں کی طرح برتنا تھا۔ بھئی۔ تم جو کہتے ہو کہ میں سمجھاؤں کیا خاک سمجھاؤں مجھ کو یہ کلنگ کا ٹیکا لگنا تھا کہ ایسی بیٹی اُٹھائی ہے۔ بیٹا بات یہ ہے وہ ساس ٹھیریں وہ بہو۔ وہ جانیں وہ جانیں۔ مجھے اپنی سمدھن سے یہ کہوانا نہیں کہ سمدھن ہی فساد کی جڑ ہیں۔ ہاں تم کہتے ہو تو اس نابکار کو کہلا بھیجتی ہوں کہ یہ کیا پاکھنڈ پھیلائے ہیں مجھے کچھ تیرا گھر بگڑوانا نہیں۔ ایسی باتیں کیں تو سب سے پہلے میں مرتے دم تک اپنی صورت نہ دکھاؤں گی اور نہ تیری دیکھوں گی۔" شباب خاں بھنائے۔ اُنھوں نے سمجھا تھا کہ اماں جان کا فضیحتہ ہوگا۔ بولے۔

"چچی اماں آپ ناحق اُن پر خفا ہوتی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس معاملہ میں وہ ویسی ہی بے قصور ہیں جیسا میں۔ اماں جان کو حکومت کی عادت ہے اُن کی بدمزاجی آپ جانتی ہیں۔ خیر۔ اب آپ اپنی صاحبزادی کو سمجھائیے کہ خدا کے لئے کچھ کھائیں ورنہ کہیں بیمار نہ پڑجائیں تو اور لینے کے دینے پڑیں۔" ساس فرمانے لگیں "اگر تم بے قصور سمجھتے ہو تو خیر۔ اور بات ہے۔ اوّل تو ماشاءاللہ تم خود عقلمند، پڑھے لکھے، سرکار کے عہدہ دار، اب بیاہے گئے اور کل بچہ والے ہو گے، خود سب باتیں سوچو۔ میں ابھی مغلانی کو بھیجوں گی اور خوب سمجھواؤنگی۔ دیکھو۔ بیٹا! وہ میری لڑکی ہے مگر تم بھی ڈھیلی رسّی نہ چھوڑنا۔ اپنا دباؤ رکھنا۔ کیا معنی تم منت سماجت کرو اور وہ کھانا نہ کھائے۔ نہیں کھاتی تو نہ کھائے ڈراتی کس کو ہے۔ جان اپنی ہلکان کرے گی کسی کا کیا لے گی۔ ہاں تم نے بھی تو کچھ کھایا نہ ہوگا کچہری بھی تو جانا ہے میں بغیر کھلائے نہیں جانے دُوں گی۔

واہ میرے بچے پر کیا مصیبت ڈال رکھی ہے"
غرض زبردستی کھلا پلا کر داماد کو روانہ کیا اور یہ عین مصلحت تھی۔ ڈر تھا کہیں فاقہ میں داماد کا مزاج تیز نہ ہو جائے۔ شباب خاں گھر آئے بیوی سے کہا۔
"بیگم میں چچی اماں کے پاس گیا تھا وہ اپنی مغلانی کو تمھارے پاس بھیجتی ہوں گی۔ وہ بہت ناراض ہوئیں کہ یہ کیا فیل مچا رکھے ہیں"
"ہاں کیوں نہیں۔ میرے تو سب دشمن ہو گئے ہیں۔ سارے جہاں میں ایک میں ہی تو بری ہوں۔ وہ میری جگہ ہوتیں تو معلوم ہوتا کیا مزہ آتا ہے۔ جس پر گذرے وہی جانے" شباب خاں کچہری جانے سے پہلے ایک بوسہ لینا چاہتے تھے مگر ڈرتے تھے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ شباب دلھن مطلب تاڑ گئیں۔ بولیں "آپ کچہری کیوں نہیں جاتے۔ وقت ہو چکا۔ میرا مغز چاٹے جاتے ہیں یہاں آپ ہی جان پر بنی ہے۔ سر ہے کہ درد کے مارے پھٹا جاتا ہے" شباب خاں جلدی سے سر دبانے لگے اور اُن کی بیگم نے چند منٹ کے بعد اپنی بجلیاں بھری آنکھیں موند لیں۔ یہ گویا اجازت تھی کہ اب میدان خالی ہے۔ شباب خاں تو تاک ہی میں تھے مخمل سے رُخسار سے اُن کے ہونٹ جا چپکے۔
"اے ہے ہٹے۔ کدھر نکل جاؤں۔ کیا مصیبت ہے ذرا سی آنکھ جھپکی تھی تو سونے نہیں دیا۔ ہائے اللہ میں کیا اپنا سر پیٹ لوں" مگر شباب خاں مسکراتے کچہری چل دیئے۔
شباب خاں گئے کہ ادھر چچی اماں کی مغلانی پہونچیں۔
"توبہ بیوی آج کل کا زمانہ۔ اللہ کی پناہ۔ آخر ہماری بھی جوانی بیتی سسرال کو بھرا۔ ایسے لڑکیوں کے تو رسے ہی نہیں دیکھے۔ بڑی بیوی نے کہا ہے۔ ایسی حرکت کی ہے کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ساری عمر نہ بیٹی کی صورت دیکھوں اور نہ

اپنی دکھاؤں۔ میرے سفید چونڈے کی بھی شرم نہیں رکھی۔ دولہیاں۔ ہیرا وا ماد ملا ہے الہی دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ لاکھ چچی اماں کی خوشامد کی کہ آپ چلیئے اور بیٹی کو سمجھا ئیے۔ ایک نہیں مانی۔ بڑی منت سماجت کی تو مجھے بھیجا ہے۔ اے ہے بیوی میرا تو اس زینہ سے دم اکھڑ گیا" یہ سب کچھ زینہ پر چڑھتے ہوئے فرماتی گئیں کہ ساس بھی سُن لیں۔ بیچاری بڑی بی نے سمدھن کے پاس بیٹھے کے جانے کی خبر سُنی تو ہک دھک رہ گئیں۔ شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ اِدھر ماں کی مغلانی شباب دُلھن کے پاس پہونچیں تو گلے لگا لیا بلائیں لیں اور کہا۔

"بیوی نے کہا ہے۔ شاباش۔ اَب میدان مار لیا۔ ہمت نہ ہارنا۔ ہاں دیکھیو میاں کو زیادہ دِق نہ کرنا۔ مرد ذات بے صبر ہوا کرتے ہیں۔ بیوی نے یہ بھی کہا ہے کہ اٹوائی کھٹوائی بچوں کا کھیل نہیں لوہے کے چنے چبانے ہیں۔ اِستقلال ہاتھ سے نہ دو۔ میاں کو اس طرح رکھو کہ نہ بیزار ہونے پائے نہ نچنت" مغلانی نے اِدھر اودھر دیکھا آنکھیں کمرے کے باہر جھانکا اور شباب دُلھن کو ایک چھوٹی سی بوتل دی اور چپکے سے بولیں "لو اس میں بادام کا حریرہ ہے اِسے پی لو۔ بیوی نے کہا ہے ایک دو دن میں ساس کو نیچا دیکھنا پڑے گا" بی مغلانی پھر بڑبڑاتی نیچے اتریں شباب دُلھن کی ساس کی خوب ہاں میں ہاں ملائی، اور سمدھن کی بیٹری برابر جتاتی رہیں۔ بڑی بی کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ مغلانی کا منہ نوچ لیں اور خوب صلواتیں سمدھن کو سنائیں۔ مگر مجبور تھیں۔ کوئی بات پکڑی جائے تو اِک بات بھی ہے۔

سارے کنبہ میں ایک ڈھنڈورا پٹ گیا کہ شباب دُلھن نے اٹوائی کھٹوائی لی ہے شاید ہی کہیں تار برقی کا اس قدر اچھا انتظام ہوتا ہوگا جس قدر گھونگھٹ والی دنیا میں خبر رسانی کا نظام قایم ہے۔ ایک بیوی نے میاں کی چوری چھپے زیور

گروی رکھا اور اُس کی خبر شہر کے اُس کنارے رشتہ دار کے ہاں سن لیجئے۔ کسی بے اولادی نے اولاد کے لئے چھپواں عمل پڑھوایا اور کمر پر گنڈا باندھا میاں کو کانوں کان خبر نہیں۔ دور کے کنبہ والے جو بس عید کے دن کو مل لیے مل لیے، وہ عمل اور گنڈے کی داستان سے پورے باخبر۔ دولت بیگم کے صاحبزادے نے حسینی خانم انّا کی لڑکی سے دل لگایا۔ دولت بیگم نے چپکے چپکے ناخواندہ مہمان پوتے کو قبل از وقت دنیا میں بلوایا اور لوٹا بھی دیا، مگر ان کے میاں خاں بہادر زردار خاں صاحب کے کان تک بھنک بھی نہیں پہونچی مگر کنبہ کی کنواری لڑکیوں تک کو سارا قصہ معلوم۔ اٹوائی کھٹوائی تو کوئی خفیہ سازش نہیں، کھلے بندوں لیجاتی ہے اس کی خبر تو آناً فاناً کنبہ بھر میں پھیل گئی جن کے کان ہوں ان کے منھ بھی ہوتے ہیں اور جتنے منھ اتنی باتیں۔

ایک بیوی جن کی بڑی آرزو تھی کہ اپنی بیٹی شباب خاں کو دیں، مگر بڑی بی نے اس مزیدار تنقید کے ساتھ ٹکا سا جواب دیا تھا:-

"گوبر کا چوتھ۔ مٹی کا تھوا۔ ایک آنکھ پچھم کو دیکھے ایک پورب کو میرے شباب کی کیا قسمت پھوٹی ہے کہ ایسی بہو لاؤں" یہ بیوی شباب دلھن کی اٹوائی کھٹوائی کا حال سن کر بولیں۔

"ناک رگڑ رگڑ لیتیں تو اپنی بیٹی نہ دیتی میں تو جانتی تھی کہ ایسی ڈائن ساس بہو کو جیتا نہ چھوڑے گی اور بوا کیا میری بیٹی دو بھر تھی"

ایک اور غریب بیوی کی بیٹی کے متعلق شباب خاں کی والدہ نے فرمایا تھا۔

"لو بوا اور سنو! رہیں جھونپڑوں میں محلوں کے خواب، ایک وقت خالی ہنڈیا میں ڈوئی ہلتی ہے۔ ان کی بیٹی لوں تو میرے خاک ارمان نکلینگے" ان بیوی نے ساس بہو کی لڑائی کا حال سنکر کہا۔

"اَب اَمیروں کی لڑکی نے مزہ چکھایا۔ مجھ سے لاکھ کہا کہ میری ساڑھی کے لیئے، میں نے کہدیا: "نہیں بوا۔ کمخواب میں کمخواب کا پیوند ہی بھلا لگتا ہے تم اَمیر ٹھیرے ہم غریب۔"

فرزانہ بیگم شباب دُلھن کی ساس کی بڑی ملنے والی تھیں بولیں "جیسا ساس کے ساتھ کیا ویسا آگے آرہا ہے۔ جتنا بہو ناچ نہ نچائے کم ہے۔"

بڑی بیٹی کی ساس اپنی سمدھن کے کچوکے خوب کھا چکی تھیں، بہو کو سُنا کر بولیں

"ایسی بدبیتی ساس کا یہی علاج ہے۔ مجھ بچاری کا کیا جو جی میں آیا فضیحتہ کر دیا۔ اب دیکھو دوسری سمدھن شباب دلھن کی ماں کیسا ٹھیک بناتی ہیں۔ گھر میں رہنا دشوار نہ کر دیں تو سہی۔ کہیں میرا صبر خالی جائے گا۔"

شام کو شباب خاں کچہری سے ذرا سویرے اُٹھے اور اپنی چچی امّاں کے پاس گئے۔ پوچھا کیا ہوا۔ ساس بولیں۔

"بیٹا! خدا تمھیں جیتا رکھے۔ تم نے سچ کہا تھا۔ اُس نبختی بھولی بھالی کا کچھ قصور نہیں۔ میں بھی تو یہی کہتی تھی کہ ایسی بے زبان ایسی صبر والی یوں کایا پلٹ ہو جائے۔ بیٹا ہم تو اَب بڈھے ہو گئے۔ تمھاری ماشاء اللہ جوان عقلیں ہیں۔ نئی روشنی کی تعلیم ہے۔ مگر ایک بات بڑوں کی یاد رکھنا۔ دو برتن ایک جگہ ہوتے ہیں تو کھڑکتے ہی ہیں۔ رہا یہ کہ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ساس اور بہو الگ ہو جائیں۔ اس میں بڑی بدنمائی ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہو گا کہ بہو اپنی خانہ داری الگ کر لیں۔ بیچاری سمدھن کا بڑھاپا ہے۔ جوان آس جوان تو بیٹھی رہیں اور ہمسایہ کی بدحواس بوڑھیاں کہاں تک گھر کے بکھیڑے کریں۔"

شباب خاں اس رائے پر اُچھل پڑے۔ بسٹر مانٹیگو( )
اس پر نازاں نہ ہوں کہ 'دوعملی' کا تصور اُنھیں کے دماغ میں آسکتا ہے۔ اگر صاحب وزیر ہند ہندوستانی ہوا کرتے تو کسی ایک وزیر ہند کی بیوی اور والدہ ماجدہ کی خانجنگی

کبھی کا اِس مسئلہ تقسیم اقتدار کو حل کرا چکی ہوتی۔ شباب خاں اِس نئے خیال کو لیئے ہوئے گھر آئے اور بیگم کے مزاج کو ذرا دھیما پایا۔ کچھ تو اس دھیمے پن کا باعث بادام کا حریرہ تھا اور بہت کچھ اس کا سبب ماں کی تاکید تھی کہ میاں کو زیادہ دِق نہ کرنا۔ بہر حال بیگم کا مزاج نازک اِس قابل تھا کہ شباب خان پلنگ پر پاس آن بیٹھے اور بولے "بیگم چچی اماں نے آج وہ بات بتائی ہے کہ تم بھی خوش اور سب خوش۔"

شباب دُلہن مری سی آواز میں کہنے لگیں۔

"اے ہٹے۔ بس آپ جانیں آپ کی چچی اماں جانیں۔ مجھے دُنیا سے سروکار نہیں" شباب خاں نے ڈرتے ڈرتے کچھ بوسوں کی مدد سے کچھ خوشامد درآمد کی کمک سے تارک دنیا بیگم کو سٹر ماننگو والی تجویز سنائی۔ انتہا پسند کانگریسیوں کی طرح بیگم ناک بھوں چڑھا کر آتش فشانی کرنا چاہتی تھیں مگر فہم عامہ نے زبان کی باگ پہ ہاتھ رکھا اور ماں کی متواتر تنبیہ نے کہ "میاں کو دق نہ کرنا" لب گویا پر مہر لگا دی۔ بولیں "آپ میرے سرتاج ہوں آپ جو حکم دیں مجھے اُس میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر آپ ہی سوچیئے میرا دل سُنتے سُنتے پکا پھوڑا ہو گیا ہے۔ وہ تو آپ کی محبت کے بھروسہ . . . . . ." یہاں آواز بھرا گئی اور شباب خاں کے ہونٹ لب لعلین سے جونک کی طرح چمٹ گئے۔ دو عملی قایم ہو گئی اور شباب دُلہن نے فتحمندانہ سانس لیکر دل میں کہا۔

"بس ایک اور اٹوائی کھٹوائی ساس کا کام تمام کر دے گی۔"

اٹوائی کھٹوائی جس طریقے سے لی جاتی ہے اور جس طرح اس کا جواب "سرتاج" کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اِن سب باتوں کا انحصار ہر گھر کی مدنیت پر ہے۔ انتہائی متمدنہ گھروں میں ایک وقت کا فاقہ اور ذرا سی غشی اٹوائی کھٹوائی کے مقصد کو پورا کرا دیتے ہیں۔ شباب خاں جیسے متوسط گھرانوں کی حالت آپ پر

روشن ہو چکی ہے۔ طبقات اجتماعی کے نچلے طبقوں میں جوں جوں مدنیت کم ہوتی جاتی
ہے اٹوائی کھٹوائی کے طریقہ اور اس کے جواب میں بہت بڑا بیّن فرق ہوتا جاتا ہے
شرفو قصاب کی بیوی اٹوائی کھٹوائی میں فاقہ کی قائل نہیں۔ زبان کو بے لگام کرنے
اور دھڑا دھڑ سینہ کوبی کو اپنے میاں کے ٹھوس دل میں احساس پیدا کرنے کے
لیے زیادہ زود اثر مانتی ہے۔ اگر اپنے آپ سینہ کوبی سے میاں شرفو ٹس سے
مس نہ ہوں تو پھر اس کی تدبیر کرنی پڑتی ہے کہ اُس قسی القلب کو اس بات پر
مجبور کیا جائے کہ وہ سونٹے کا زبردست قانون جاری کرے اور پھر دیکھئے کہ اُس
کی گھر والی کہاں تک درد اور اذیت سہنے کو تیار رہے اپنے آپ سینہ اور سر پیٹنے
سے میاں شرفو یہ خیال کرتے ہوں "جیسوا! اپنے آپ کو چوٹ تھوڑی لگنے دیتی
ہے۔ ہتیلی سمیٹ کر لگاتی ہے کہ آواز بہت ہو" اس قدر جوش میں لانے کے
لئے میاں شرفو سر مائیکل کی طرح سونٹے کے قانون کو حرکت دیں، شرفو کی بیباک
گھر والی کی آسان تدبیر یہ ہے کہ میاں شرفو کی شرعی حد سے آگے بڑھی ہوئی داڑھی
پر اس طرح ہاتھ ڈالا جائے جیسے کوئی سوکن کی چوٹیا پکڑتا ہے۔ شرفو کی گھونگھٹ
والی اُس کی صاف ستھری داڑھی سے جلتی بھی ہے کہ اُس کی غور و پرداخت،
نگہداشت اور سنوارنے کا خیال میاں شرفو بیوی سے زیادہ کرتے ہیں۔ گھر
والی نے جہاں چکنے چکنے بالوں کو پکڑ کر جھنجھنے کی طرح ہلایا اور بس میاں شرفو
کے قلب کے کمزور اور دُکھتے حصے کو ٹھیس دیدی۔ ماں بہن، دادی نانی کے
نوازنے اور خود میاں شرفو کی مردانگی پر حرف دھرنے کا یہ اثر نہیں ہوتا جو
چاہیتی داڑھی کے ذرا سے چھیڑ دینے کا ہوتا ہے۔ جھنجھنے کی طرح ہلانا تو آپ
بھی تسلیم کریں گے ستم ہے۔ لہذا قانون عصا نفاذ پانے لگتا ہے۔ گھر والی
اور بکھر جاتی ہے بپھر جاتی ہے "ارے مار دیکھوں تو کیسا پہلوان ہے۔ کہاں تک

مارے گا۔ میں آج یا اپنی جان دوں گی یا تیری جان لوں گی اور داڑھی کا ایک ایک بال کروں گی" جب دس بارہ سونٹے جی کھول کر کھا چکتی ہے اور میاں شرفو ہار کر شل ہو کر سونٹے سے باز آتے ہیں تو پھر دو گھنٹہ کا باقاعدہ دردناک ماتم ہوتا ہے میاں شرفو تو خیر لوٹ آتے ہی ہوں گے، ہم محلہ آپ۔ تو لا اُٹھتے ہیں کیونکہ واقعی جیخ سے جو رونا آتا ہے اُس سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔

آپ غالباً خیال فرمائیں اور سر مائیکل تو یقیناً اعتقاد رکھتے ہوں گے کہ سونٹا ایسے مواقع پر انصاف کی قریب ترین بقیہ ہے اور شورش کو نگل جانے کے لئے عصائے موسیٰ سے کم نہیں مگر میاں شرفو جانتے ہیں کہ گھر والی نے جہاں سونٹا اُٹھانے پر مجبور کر دیا اُس کے معنے یہ ہیں کہ گھر والی جیت گئی۔ اول تو سونٹے کی ورزش سے میاں شرفو کی ساری بھڑاس اور اس کے ساتھ ارادے کی پختگی بھی نکل جاتی ہے۔ دوسرے، غصہ کے فرو ہونے کے ساتھ ہی گھر والی کی چوٹ پھیٹ کا خیال، گھر والی کے جتنے طرفدار جذبات ہو سکتے ہیں اُن کو میاں شرفو پر حاوی کر دیتا ہے۔ چنانچہ صبح کو میاں شرفو وہی کرتے ہیں جس کی مخالفت میں ظاہرہ سونٹے کے بڑے زبردست استدلال سے کام لیا تھا۔

ہم یہ عرض کر آئے ہیں کہ اٹوائی کھٹوائی ستیاگرہ کی ماں ہے۔ مہاتما جی نے وہ زبردست ہتھیار اُٹھایا ہے کہ جس میں واقعی ہار کے تخیل کو دخل نہیں خواہ ایک سر مائیکل کی جگہ لاکھ سر مائیکل کیوں نہ بن جائیں۔ اِس ہتھیار کے استعمال کو ہندوستانی مرد رفتہ رفتہ ہی سمجھ سکیں گے، مگر ہندوستانی ساڑی والیاں اور کھڑے پائنچے والیاں خوب سمجھتی ہیں اور صرف سمجھتی ہی نہیں منجھی ہوئی ہیں ستیاگرہ کے خطرہ کو ہز ایکسیلنسی سے زیادہ ہر ایکسیلنسی، سٹرانیگو سے بہتر

مسز مانٹیگو، اور ہز مجسٹی سے بڑھکر ہر مجسٹی سمجھ سکتی ہیں۔ کاش اس وقت انگلستان میں، سایہ والیاں، کوس لمن الملک بجاتی ہوتیں! تب کہیں پارلیمنٹ کی سمجھ میں آتا کہ مہاتما جی اور بوا سروجنی کا ستیا گرہ، گھر گھر پھیل جائے اور ہندوستان کی گھونگھٹ والی دنیا اَنوائی کھٹوائی لے لے اور اپنے اپنے دولہ میاں سے کہدے۔

"اُس وقت تک نہ ہم تمھاری بیوی نہ تم ہمارے میاں جب تک بھارت ماتا کو سواراج نہ ملے"۔ تو کیا تماشہ ہو۔ اس طرح ہر سہری سے "وندے ماترم" کا مقدس نغمہ بلند ہو تو کیا پھر بھی مسٹر مانٹیگو اور ہز ایکسیلنسی "ہنوز دہلی دور است" کا پرانا گیت گاتے رہیں گے[1]؟

---

[1] - ملاحظہ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ ۔

اٹکلیں

قلم اٹھایا اور اس سرخی پہ۔ تو خیال آیا کہ اس عجیب و غریب لفظ کی سوانح عمری بھی عجیب ہوگی۔ کہتے ہیں کہ الفاظ میں جان ہوتی ہے۔ مگر یہ مسئلہ ایسا نازک ہے کہ اس کو فلسفیوں کے ہی حوالے کیجیئے تو بہتر ہے۔ نہ راقم اس کی بال کی کھال کھینچ سکتا ہے۔ اور نہ قارئین کرام اس نازک ذہنی عمل جراحی سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ البتہ اتنا مان لینا آسان ہے کہ الفاظ پیدا ہوتے ہیں ارتقاء پاتے ہیں۔ مذکر یا مونث ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے پیوند ہوتے ہیں۔ ان کے بچے ہوتے ہیں اور وہ جیسا کہ دنیا کی ہر شئے کا انجام ہے مر بھی جاتے ہیں بعض کے ڈھچر مصر کی ممیوں کی طرح باقی رہتے ہیں اور اکثر تو بالکل مٹ جاتے ہیں۔ اگر آپ نے اتنا مان لیا۔ اور ماننئے بھی بلا استدلال کیونکہ اس سرخی کے تحت راقم استدلال کو حتی الوسع پاس پھٹکنے نہ دے گا تو باقی ہی کیا رہا۔ یہ بھی مان ڈالئے کہ الفاظ رنگ روپ صورت شکل اور وضع قطع بھی رکھتے ہیں اور جب اس قدر ادر آپ نے مہربانی فرما کر مان لیا تو لگے ہاتھوں اسے بھی کیوں نہ منوا لیا جائے کہ بعض الفاظ ایسی وضع قطع کے ہیولیٰ۔ خوتی سے ہوتے ہیں کہ ان سے ظرافت پڑی ٹپکتی ہے اور ہنسی ان کے گلے میں باہنا

ڈالے کھلکھلاتی پھرتی ہے۔ انسانوں میں بھی یہی حال ہے۔ بعض اللہ کے لال ایسے بھی ہوتے ہیں کہ آدمی کی سی صورت سہی مگر فطرت نے ظرافت کی ترنگ میں کچھ ایسے خدوخال بنائے ہوتے ہیں کہ دیکھتے ہی آپ بیساختہ ہنس پڑیں۔

ایسے ہنسی لپیٹے لفظ ہر زبان میں ہوتے ہیں ہماری اُردو بھی اُن سے خالی نہیں۔ بلکہ اُردو میں چونکہ بھانت بھانت کی بولیاں کیمیاوی آمیزش پا رہی ہیں قیاس یہ چاہتا ہے کہ اُردو میں ایسے ہنسی کے پوٹ الفاظ کسی طرح انگریزی سے کم نہ ہونے چاہئیں۔ بہرحال اُلگریس اور اوس کا علاتی یا اخیافی بھائی اُٹکل پچو اسی قبیلہ کے ہیں۔ بہت کوشش کی کہ اُس کے ماں باپ کا پتہ چلے مگر افسوس ہے کہ ہماری کوششوں نے کامیابی کا تاج حاصل نہیں کیا۔ اور اُس کے ماں باپ کا پتہ نہیں چلا۔ اس میں کوئی ایسی قباحت تو ہے نہیں اس لئے کہ انسانوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کے شجرہ کا پتہ نہیں چلتا تو پھر بیچارے اُلگریس کا خاندان اگر شیکسپیر کے خاندان کی طرح ناقابلِ تحقیق ہو تو کون بڑی خرابی کی بات ہوئی۔ غرض اُلگریس کا شجرہ قارئین کرام کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی صاحب کو اتفاقاً کچھ پتہ چل جائے تو براہ کرم کسی لغت نویس کو مطلع فرمادیں۔

یہ تو اُن کے شجرہ کا حال ہے اب اُن کی خوبو پر نظر دوڑائیے۔ اُلگریس عجیب بات ہے کہ اس میں کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔ ہندوستان کی کالونس جھلکتی ہے نہ بھوراپن۔ مغلوں کی پلساہٹ ٹپکتی ہے نہ آریاؤں کی میدے اور شہاب والی دلفریبی۔ اس کا رُوپ انگلستانی نژادوں سے ملتا جلتا مگر ہندی ہے۔ ڈیل ڈول کڑیل ہے۔ سر سے پیر تک مستعدی ہے کہ اُبلی

پڑتی ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ ایک گراں ڈیل گنوار کاندھے پر ایک بڑا سا بھاری لٹھ رکھے کان کی لو تک باچھیں کھولے کھڑا ہے۔ آواز میں کچھ نہ پوچھئے انگلستانی حضرات سے اس قدر رشا بہت ہے کہ انگریزی عبارت میں بٹھا دیجئے تو گمان بھی نہ ہو کہ یہ آبنوسی نژاد ہے ذرا اُس کے باطن کی بھی تھاہ لیجئے۔ باطن کیا ہے نرا جذبات کی پوٹ ہے عقل کو دور سے دیکھا اور ایک قہقہہ مارا۔ استدلال سے فطرتاً بیر ہے۔ ارسطو اور مل ( ) سے خلقی بغض ہے۔ ایک عجیب بدتمیزی آپ کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے وہ یہ کہ موقع ہو یا نہ ہو آپ اچھل پڑتے ہیں یا بیچ میں ٹپک پڑتے ہیں یہ انگریس صاحب کی ہیئت کذائی اور یہ ہے کیرکٹر ہے۔

ماں باپ کے متعلق ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ماں باپ تو ضرور ہوں گے پتہ اس کا نہیں چلتا کہ وہ کون تھے کیا تھے۔ بہر حال ان کا وجود اس کا شاہد ہے کہ یہ کسی نہ کسی طرح پیدا ضرور ہوئے۔ کس سنہ میں پیدا ہوئے اور کس جگہ پھلے پھولے فضائے ادب اُردو میں اُن کا بلند قہقہہ سنائی دیا یہ ایسے امور ہیں کہ اُن کا بھی کھوج لگانا بہت مشکل ہے۔ راقم کا خیال ہے۔ آپ مانئے یا نہ مانئے مجھے اِصرار نہیں۔ کہ اُن کا سن برطانوی حکومت سے چھوٹا ہے۔ رہا مولد و منشا آپ کی شان تو اِس قیاس کی طرف مائل کرتی ہے کہ آپ کسی شہر میں اور اس شہر کے کسی بھنگڑ خانہ کی دھواں دھار فضا میں ظہور پذیر ہوئے ہوں گے۔

مگر آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ اس عجیب الخلقت ناتحقیق لفظ کو زیب عنوان کرنے سے کیا حاصل؟ اِس کا راز ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اِنسان کے خیال کا ایک دریا کا سا بہاؤ ہے۔ سوچنا جسے کہتے ہیں اِس کے معنے

صرف یہ ہیں کہ اِس بہاؤ کے کسی حصّے پر آپ نے نظر گڑو دی ہے اور اُس کی روانی کے ساتھ آپ کی نظر بھی بہہ رہی ہے اور یہ بھی محض چند لحظوں کے لئے، اِسی کا نام توجہ ہے۔ بڑے بڑے عالی دماغ جو تُرا تیر مارتے ہیں وہ یہی ہے کہ بار بار اپنی نظر کے سامنے نفسی رو کے کسی حصہ کو لے آتے ہیں۔ اگر نفسی زندگی کے متعلق اِس بہاؤ کے استعارے کو صحیح مان لیجئے۔ تو پھر ظاہر ہے کہ ہماری ہر لحظہ کی زندگی بے گنتی خیالات سے معمور ہوتی ہے اور یہ کہ ان خیالات میں ایک دوسرے سے استدلالی تعلق نہیں ہوتا اور ہو نہیں سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کے خیالات کی رَوْ کا چربہ اُتار دیا جائے؟ یہ خیالات کا بہاؤ جان کے ساتھ ساتھ مَوجیں مارتا ہے آپ جاگتے ہوں یا سوتے۔ بے غل وغش سُوتے ہوں یا خواب دیکھتے ہوں کسی کام میں اِس قدر محو ہوں کہ اپنے آپے کا ہوش نہ ہو یا اپنے آپ کو منھ میں گلوری اور حقہ کی منھال آڑائے خیالات کے بہاؤ پر چھوڑ دیا ہو۔ یہ نفسیاتی مسئلہ ایک پہیلی سا معلوم ہوتا ہے مگر ایک مثال لیجئے تو صاف ہو جائے گا۔

فرض کیجئے کہ قارئین کرام میں سے کسی اہل قلم نے فہرست مضامین میں یہ عنوان دیکھا" انکریس" اب اُن کی خیالات کی رَوْ ملاحظہ فرمائیے۔

"واہ۔ یہ بھی کوئی سُرخی ہے 'انکریس'۔ اِس کے معنے یہی ہوئے انکل پچو۔ بھلا اِس پر کیا خاک مضمون لکھا جائے گا۔ کل موٹر سے میری ٹمٹم ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچی۔ ہاں تو یہ مضمون دیکھنا چاہیئے۔ چمّو ذرا حقہ اور پان اندر سے منگوا لینا عجیب بات ہے۔ زندگی میں بعض باتیں کیسی انکریس ہو جاتی ہیں۔ بھلا مجھے دیکھئے کہ اَدبیات کا مجھے خاص مذاق میرے مضامین پر لوگ سر دُھنتے ہیں مگر زندگی بھی عجیب راز ہے میری نوکری تو دیکھئے چرس اور چانڈو بھنگ اور

گانجا سیندھی اور شراب کی جانچ پڑتال۔ ہندوستان میں انسان محض قلم ا پر نہیں جی سکتا۔ کل بیگم صاحب کو کیا اچھی لیس لادی ہے۔ خوش ہی تو ہو گئیں اور کیا چپکے سے ہونٹوں کا بوسہ دیدیا۔ عورت نمود کی چیزوں کو کیں قدر پسند کرتی ہے۔ فطرت کو کون بدل سکتا ہے۔ کل عہدہ دار صاحب کیا اٹکر لیس بکواس کر رہے تھے۔ بات کا سر نہ پیر اللہ کی شان ہے۔ گدھوں کو بھی پالتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اَبے یہ چلم کیسی بھری ہے۔ چمتو چمتو۔ اُلو کا پٹھا کہیں کا۔ دیکھ تو سہی چلم راکھ میں الٹی ہوئی ہے۔ حقہ بولتا ہی نہیں۔ ایک لپتر دے منہ پر۔ اچھا مضمون پڑھنا چاہیئے۔ یہ مضمون نگار صاحب کون ہیں؟ معلوم نہیں کیا ستیاناس کیا ہے اس سُرخی پر تو میرے قلم سے مضمون نکلتا سارا فلسفہ حیات بھر دیتا۔ کیا خاک لکھا ہوگا۔ آج کل جس کے ہاتھ میں قلم آیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ معقول نامعقول۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دم سارے رسالے اور اَخبار بند کر دیئے جائیں۔ خیالات بلند نہ عبارت ٹھیک نہ زبان ٹکسالی۔ روپیہ بنانے سے مطلب۔ اِس پر کیا مزیدار مضمون ہو کہ ایک دفعہ تو سارے اَخبار رسالے اور اُن کے عینک باز اڈیٹر بیٹھتا ہی تو جائیں۔ چلم ٹھیک کر دی۔ ہاں اَب ٹھیک ہے۔ آنکھیں کھول کر کام کیا کرو۔ کیوں پکار رہے ہو بیٹا۔ امی جان مجھے کیوں بلا رہی ہیں۔ اچھا آتے ہیں۔ ٹھیک کہا ہے۔ شادی کے بعد اِنسان کام کا نہیں رہتا۔ اچھا اَب ذرا ہو آؤں" اور پھر گھر میں تشریف لے جاتے ہیں اور اِس عاجز کا مضمون بن پڑھا آرام کرسی کے ہاتھ پر زبانِ حال سے طلبگار نِخواندن منہ تکتا رہ جاتا ہے۔

یہ تو محض ایک مثال تھی۔ اَصلیت کا صحیح چربہ شیکسپیر اور اِنیس کے قلم سے شاید ممکن ہو تو ہو۔ غرض اِس ناچیز راقم کا اِس سُرخی کے تحت

اِیسے چربے اُتارنے کا قصد تھا مگر صاف تو یوں ہے کہ راقم سے ممکن نہیں۔ تو دوسری بہتر صورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اِس عنوان سے جس مضمون پر جی چاہا لکھنا شروع کر دیا۔ اور اِس قسم کی تحریرات کی یہ پہلی قسط ہے۔ باقی کی قسطوں کے لئے قارئین کرام کی قدر دانی اور مدیر صاحب کی مشفقانہ اِشاعت کی آمادگی زبردست شرطیں ہیں۔
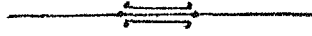
خوش مذاقی

ادب اردو میں جہاں اور بہت سی باتیں ناپید ہیں اس قسم کی ظرافت بھی جسے انگریزی میں (Light - humour.) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم نے "خوش مذاقی" مناسب سمجھا ہے بالکل مفقود ہے۔ خوش مذاقی کی تعریف بہت مشکل چیز ہے البتہ اس کے مفہوم کو اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں اس سرخی سے " ایک روپیہ کی سرگذشت" اور اس کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں کہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں۔ ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی قہقہہ کا بم ہی اُڑائے یا کھل کھلا کر بندوقوں کی باڑ سی ہی داغ دے۔ ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہئے ایک نفسی انبساط ہے اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئین پھول کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑیں تو ایسا مضمون "خوش مذاقی" کا بہترین نمونہ ہوگا۔

"خوش مذاقی" کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو اور منطقی پینترے اور داؤں پیچ ذہن کے لئے پُرلطف ورزش بھی ہو جائیں بہرحال اس نوٹ میں "خوش مذاقی" کے زیادہ تجزیہ کی گنجائش

نہیں۔ یہاں ہمیں اپنے معزز قارئین کی خدمت میں اتنا عرض کرنا ہے کہ قارئین کرام کی خاطر اور اردو ادب میں خوش مذاقی کی کمی کے مدنظر ہم اس ٹوہ میں تھے کہ کوئی اس قسم کا نفیس اور گدگدانے والا صاحب قلم ہاتھ لگے۔ ہماری نظر ایک صاحب پر تھی۔ لیکن کچھ تو طبعی کاہل وجودی اور بہت کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اُن کو لکھنے پر آمادہ کرنا جوئے شیر لانا تو نہیں ہاں کسی نودریافت محبوبہ کے رام کرنے سے کم نہ تھا۔ اُنہیں کے قلم کی ستم ظریفی ہے اور اُنہوں[1] نے اس کو پسند فرمایا کہ "مرزا الم نشرح" کے نام کے پردہ میں اپنے آپ کو مخفی رکھیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے قارئین اس "الم نشرح" اخفا کا خیال نہ فرمائیں گے۔ ایسی صورت میں کہ "مرزا الم نشرح" کی لطیف تحریر اور لطیفہ سنج طبیعت ان کو محظوظ کرتی ہے۔ ہماری نظر میں اُن کا مضمون "ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحے" جو قارئین کے ملاحظہ میں پیش ہیں اور اسی قبیل کے مضامین جو آئندہ ہدیۂ ناظرین ہوں گے "خوش مذاقی" کی اُن خصوصیات سے سجے اور سنورے پائے جائیں گے جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے مطالعہ کے بعد ہمیں یقین ہے کہ یہ بات آپ پر خود "الم نشرح" ہو جائیگی۔

---

[1] مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔

کتاب کے کیڑے

چارلس لیمب نے نسل انسان کو دو انواع میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو قرض لیتے ہیں اور دوسرے وہ جو قرض دیتے ہیں۔ یہ تقسیم بڑی حد تک درست ہے اور تقریباً کل ہندوستانی مسلمان پہلی نوع میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تقسیم کی حدیں پتھر کی لکیریں نہیں۔ ایسے اللہ کے بندے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی زندگی کی ابتدا میں قرض لینے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ جہاں کوئی گرم جیب والا ہاتھ لگا اور وہ قرض مانگ بیٹھے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ یہ خود صاحب ثروت ہو گئے اور حاجتمندوں کی قرض سے دستگیری فرمانے لگے۔ اس طرح ایک نوع سے دوسری نوع میں بدل جانا صرف ممکن ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی بات ہے۔

اگر نوع انسان کی تقسیم اس طرح کیجائے کہ ایک خانہ میں وہ لوگ ہوں جو کتاب کے کیڑے ہیں اور دوسرے میں وہ جو اس طرح کے کیڑے کہلانے کے مستحق نہیں تو یہ تقسیم لیمب والی تقسیم سے زیادہ فطری ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہونے کے بعد قرض دینے یا لینے والا بن سکتا ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر اس کی معاشی حالت پر ہوتا ہے۔ لیکن کتاب کا کیڑا ماں کے پیٹ ہی سے کتاب کا کیڑا بن کر نکلتا ہے اس دھوکے میں نہ پڑنا چاہیئے کہ ہر کتاب کا

دیکھنے والا کتاب کا کیڑا ہے۔ کتابوں کا دیکھنا اور بات ہے اور کتاب کا کیڑا بننا اور چیز۔ ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

کتاب کے کیڑوں کی بھی دنیا کی ہر چیز کی طرح بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک قسم اُن کی ہے جو نمائشی کیڑے ہوتے ہیں۔ اُن کو کتاب کا بڑا شوق ہوتا ہے اور جہاں ان کو خوبصورت جلد نظر آگئی اور یہ بیتاب ہو گئے لوٹنے لگے۔ اُن کے گھر یلو کتب خانہ میں آپ پیاری پیاری دلکش اور خوشنما جلدیں پائیں گے جن کی پشتیں سنہری حروف میں مسکراتی ہیں جس طرح ـــــ ـــــ خیر تشبیہ کو جانے دیجئے۔ اس قسم کے کتاب کے کیڑے کتابوں کے حسن کے ایسے متوالے اور قدردان ہوتے ہیں کہ کتابوں کو چھوئی موئی بنا دیتے ہیں۔ نہ خود ہاتھ لگاتے ہیں اور نہ کسی اور کو ہاتھ لگانے دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک چھونے سے کتاب خراب ہو جاتی ہے کھول کر پڑھنا اور گھنٹوں پڑھنا تو بس کتاب کو ستیاناس ہی کر دینا ہے۔ اُن اصحاب کا کتاب کا دیکھنا ہی ہے کہ کتب خانہ میں بیٹھ گئے اور کتابوں کی قطاروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے گئے اور اخبار پڑھتے گئے اُن سے کبھی بھولے سے بھولے پن کے ساتھ آپ کتاب مستعار مانگ بیٹھئے تو غضب ہی کر دیا۔ وہ چونک پڑتے ہیں اور اس قدر اہمیت اور سنجیدگی اُن کے چہرہ پر دوڑ جاتی ہے گویا کسی نے ان کی صاحبزادی سے پیام دیدیا یا آنکھوں سے اس طرح کا شک اور شبہ ٹپکنے لگتا ہے گویا مانگنے والا امیر علی ٹھگ کے قبیلہ سے ہے اور کتاب کو ٹھگ کر ہضم کرنا چاہتا ہے۔ ان کتاب کے کیڑوں کو کتاب سے افلاطونی محبت ہوتی ہے۔

اُن کے بالکل برعکس جو کیڑے ہیں وہ کتابوں کی جلدوں کی خوشنمائی اور سنہری پشتوں سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو اس ظاہری دلکشی

اور نظر فریبی سے یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ بس یہ کتابیں نری دکھاوٹ ہی کی ہیں۔ اُن کے باطن کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایک ایسے کیڑے اِس درجہ غلو کر گئے تھے کہ وہ اچھی سے اچھی تصنیف کو بھی اچھی جلدیں برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ سرے سے پڑھتے ہی نہ تھے۔ کچھ یونہی سی چھپی ہوئی پھٹی پُرانی کرم خوردہ کتاب پر لٹو ہو جاتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ کتب بینی علم کی خاطر ہوتی ہے اور علم ایک باطنی چیز ہے۔ کتاب کی سیرت اصل شئے ہے۔ نری اچھی صورت سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ ان حضرات کی محبت ڈس ڈمونا (   ) کی سی محبت ہے۔ اوتھیلو (   ) کی دھواں کھائی جلد سے اُسے سروکار نہ تھا بلکہ وہ تو اوتھیلو کی سیرت پر مرتی تھی۔

کتاب کے کیڑوں کی جس قسم کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اس سے ملتی جلتی کیڑوں کی ایک اور شاخ ہے جس کا مقولہ یہ ہے کہ کتاب ایسی ہونی چاہیئے کہ اُسے جس طرح چاہیں برت سکیں۔ ایک ہاتھ میں حقہ کی نے ہے۔ کتاب کو بیچ میں سے موڑا اِس طرح کہ ذرا ٹانکے ڈھیلے ہو جائیں اور دوہرا کر لیا۔ اب کیا ہے آسانی سے کتاب کو ایک ہاتھ میں لے لیا۔ حقہ کا حقہ پیتے رہے اور کتب بینی کی کتب بینی ہوتی رہی۔ بھلا نفیس جلد والی کتاب کا اِس طرح دھڑ توڑنے کی کب ہمت ہوسکتی ہے۔ پھٹے حالوں سستی کتاب کو دیکھتے دیکھتے رکھنا پڑا تو صفحہ کا ایک کونا لیا اور ولایتی کتے کے کان کی طرح موڑ دیا۔ کسی نشانی وشانی کی حاجت نہیں۔

اس قماش کے ایک کیڑے کے کتب خانہ میں معمولی الماریاں تھیں۔ کسی خانہ میں شیشہ تھا اور کسی میں نہیں کوئی کتاب ایسی نظر نہ آتی تھی جس کی پشت پر جھریاں اور دراڑیں نہ پڑی ہوئی ہوں۔ پشت پر نام کے متعلق صرف یہ گمان ہوسکتا تھا کہ کبھی یہاں حروف تھے۔ آپ نے کسی کتاب کو نکالنا چاہا تو

جلد نکلی چلی آتی ہے یا اگر اس خانہ میں بہت سی کتابیں اور بھری ہوئی ہوں اور آپ نے ہاتھ آگے کو ڈالکر کھینچا تو بیچ میں سے کتاب نکلی چلی آتی ہے جلد بیچاری پھنسی کی پھنسی رہجاتی ہے۔ ان بزرگوار کا استدلال یہ تھا:۔

"ارے یہاں کتابیں پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں یا نری دیکھنے کو؟ ایسی کتابیں کیا کہ ان سے کام لیتے آپ کا دل دکھے یا آپ کو ادب آداب سے بیٹھ کر پڑھنا پڑے۔ ایسی کتابیں کیا ہوئیں وبالِ جان ہوئیں۔ اور یہ بھی تو خیال کرو کہ علم کو سستا ہونا چاہیئے کتابیں سستی نہ ہوں گی تو پھر علم کب سستا ہو سکتا ہے؟ آپ یہ جتنے فیشن ایبل کتب خانے دیکھتے ہیں وہاں کیا خاک کتب بینی ہوتی ہے یوں کہو کہ کتابوں کی تماش بینی ہوتی ہے"

بعض کتاب کے کیڑے اس مزاج کے ہوتے ہیں اور یہ ایک قابلِ قدر نوع ہے کہ کتاب کے پڑھتے ہی ان میں لکھنے کی ریس بیدار ہو جاتی ہے۔ وہ بغیر پنسل یا سیاہی دار قلم کے پڑھ نہیں سکتے۔ ان میں سے بعض تو سطروں کے نیچے یا حاشیہ پر لکیروں کا کھینچ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس رجحان کے لوگوں میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو حاشیہ پر کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی فرماتے جاتے ہیں اور جہاں کہیں خالی صفحے مل گئے وہاں اپنی رائے اور خیالات کا اظہار فرما دیتے ہیں۔ اس رجحان کی تہ میں اتنی سی کھوٹ ضرور ہوتی ہے کہ یہ لوگ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے وہ ہمارے حاشیے دیکھ کر ہماری قابلیت کا لوہا مان لیں گے۔ ایک عنایت فرما اس مرض میں اس قدر مبتلا تھے کہ ان کے کتب خانہ کی ہر کتاب محشّی ہو گئی تھی۔ جہاں مصنف نے کوئی ایسا خیال ظاہر کیا جو حضرت کی پسند خاطر ہوا اور جھٹ انھوں نے حاشیہ پر لکھدیا "ماشاء اللہ! مجھے پورا پورا اتفاق ہے" اگر کوئی بات پسند نہیں آئی تو

تحریراً ارشاد ہوا "قبلہ! آپ یہاں بہک گئے ہیں" اُن کی ایک کتاب تھی اُن کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اُن کے کتب خانہ کی۔ یہ کتاب غالباً لارڈ مارلے کے مضامین کا مجموعہ تھا۔ اس میں ایک مضمون تھا "مطالعہ ادبیات"! کتاب دیکھنے اور کتاب پڑھنے کے فرق پر بحث تھی۔ ایک جگہ یہ خیال تھا کہ سچ مچ پڑھنے والا بغیر پنسل کے نہیں پڑھتا۔ اس پر قبلہ نے نوٹ کیا تھا "ایسے تمہارے صدقے کیا بات کہی ہے" یہ مرض متعدی سا ہے اور ہر قسم کے کیڑوں میں اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ پبلک کتب خانوں کے قواعد میں اس امر کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ کتاب پر کچھ نہ لکھا جائے۔ ان کتب خانوں کے رکھوالوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جن کتاب کے کیڑوں میں یہ مرض گھن کی طرح لگ چکا ہے اُن کو اس لغو تنبیہ سے کس قدر دُکھ سہنا پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح کی بیرحمی ہے جس کا زخم نفسیاتی ہوتا ہے۔

کتاب کے کیڑوں کی ایک اور پہلو سے دو قسمیں ہوسکتی ہیں۔ خال خال کتاب کے کیڑے ایسے ہوتے ہیں کہ جو کچھ کتابوں سے چاٹا جائے اُس کو اَدل بدل کر یا کمی بیشی کر کے اپنی جانب سے ایک کتاب کی صورت دیدیتے ہیں اور موجودہ اور آنے والے کتاب کے کیڑوں کے لئے ذہنی اور رُوحانی غذا فراہم کر دیتے ہیں۔ اگر کسی مُلک سے ایسے لوگ کم یا مفقود ہو جائیں تو بڑا ستم ہو جائے۔ نئی کتابوں کا کال ہو جائے اور کتاب کے کیڑوں پہ ایک بپتا پڑ جائے یہ لوگ کتاب کی رَگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اس کا مغز نکال لیتے ہیں اور پھر اس مغز کو اور کتابوں کے مغز سے سلیقہ کے ساتھ گھلاتے ملاتے ہیں اور ایک نئی چیز کی صورت میں کتابی دنیا میں پیش کرتے ہیں۔ اس رنگ ڈھنگ اور آن بان کے کتابی کیڑے بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی دکھائی

اور موجودہ تعلیم کے فروغ کی بدولت اس زمرہ میں نصاب کی کتابیں بنانے والے شارحین اور طلبہ کے رہنما تیار کرنے والے حشرات الارض کی طرح نکل آئے ہیں۔ اُن کا کام یہی ہے کہ کتابوں کا پورا یا ادھورا عموماً ادھورا مغز نکالا یا اوندھا سیدھا مطلب لکھ مارا اور لیجئے صاحب کتاب تیار ہوگئی اور ملک کے سررشتہ تعلیمات کا تار مراسلوں کے ناک میں دم ہے کہ اس کتاب کو نصاب میں داخل کیا جائے یا بذریعہ مراسلہ گشتی صدر مدرسوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اس لاجواب شرح سے مدد لیکر بچوں کے ذہن میں صحیح مطالب اتروائیں اور اس طرح غلط مطلب اور سمجھنے سے ملک کے ہونہار نونہالوں کو بچائیں۔ یہ خدمت قوم کی خاطر کی گئی ہے اس سے "اس ناچیز" شارح کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اس طرح کے ایک بگڑے دل کتاب بنانے والے نے ایک کتاب یا کتابوں کا سلسلہ تیار کیا۔ بدقسمتی سے کسی سررشتۂ تعلیمات نے ہندوستان میں اس کو نصاب کے قابل اور بچوں کے لئے موزوں نہیں سمجھا۔ آپ نے عام بے قدری اور جوہر ناشناسی کا ماتم کرتے ہوئے تحریر فرمایا۔

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا وغیرہ

اصلی کتاب کا کیڑا ان سب سے انوکھا ہوتا ہے۔ وہ کتاب کو اپنی جان سمجھتا ہے۔ اگر کتاب اس سے منہا کر دی جائے تو پھر یہ بیچارہ کچھ نہیں۔ وہ کتاب کا عاشق ہوتا ہے۔ کتاب کی صورت اور سیرت کا اس کی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بھونڈی سے بھونڈی اور موہنی سے موہنی کتاب اس کی نظروں میں یکساں ہوتی ہے۔ صدیوں کی پرانی اور جدید سے جدید دوشیزۂ اشاعت دونوں پر اس کا دل لوٹ کے آتا ہے۔ دیمک لگی بوسیدہ اور چکنے چکنے کاغذ اور تصویروں والی کتابیں اس کے جذبات پر یکساں بجلیاں گراتی ہیں۔

اِس طرح کے ایک کتابی کیڑے کی عمر بھر کی آرزو یہ تھی کہ اپنے کتب خانہ کے لئے ایک نفیس اور موزوں عمارت بنائیں۔ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ اِس عمارت میں کتب خانہ کے متعلق جتنی اِیجادیں آرام اور آسایش کی یورپ میں ہو چکی ہیں اُن سب سے کام لیا گیا تھا۔ کتاب پڑھنے کی کرسی عجیب چیز تھی۔ نرم نرم اور جس طرح لیٹنا چاہو اسی طرح جھکی تلی اُوپر نیچے ہو جائے پشت پر لیمپ گیر لگا ہوا جس کو جتنا چاہا ہٹا لیا گھٹا لیا بڑھا لیا۔ اس کرسی پر دراز ہونا بچپن کا آغوش مادری میں شانتی سے لیٹنا یاد دلا دیتا تھا۔ کرسی۔ خواہ آرام کرسی ہی کیوں نہ ہو۔ پیروں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کرسی کے ہاتھوں پر پیر رکھئے یا تو ضرورت سے زیادہ اُونچے یا بے ڈھنگے پن کے ساتھ آڑے ترچھے ہو جاتے ہیں۔ اگر پنڈلیاں ہاتھوں پر ٹکی ہوئی ہیں تو گھٹنوں کو سہارا نہیں ملتا۔ ٹخنے سے لیکر پنجوں تک پاؤں کرسی کے ہاتھوں سے نکلے ہوتے ہیں۔ اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے دُکھنے لگتے ہیں۔ لیکن اُس کتب بینی والی کرسی میں پیروں والا جز متحرک ہوتا ہے اور آپ جس زاویہ تک چاہیں اُونچا نیچا کرلیں پھر اُس پر مراقش کا چمڑا منڈھا ہوا۔ لیٹتے ہی یہ معلوم ہو کہ بالائی کے ملایم ملایم ڈھیر میں دھنس گئے۔ اِس طرح دھنس دھنسا کر لیمپ کو ٹھیک کیا۔ ٹانگوں کو ٹھیک زاویہ پر لگایا۔ بنگلہ اول تو شہر کی غل پکار سے دور اور پھر رات اور دس گیارہ کا عمل۔ سوائے فطرت کی رات کی دھیمی دھیمی سُریلی اور بن سری آوازوں کے باقی ہر طرح سناٹا۔ رہ رہ کر میاں کتاب کے کیڑے کے حقہ کی گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھی گیدڑوں کی پکار کے اور کسی قسم کی کھنڈت اس سنسانی میں نہیں پڑتی۔ اس وقت کتاب کے کیڑے صاحب کے ہاتھ میں ایسے مصنف کی کتاب مان لیجئے جس کا قلم ایک ایک لفظ میں جان ڈال دیتا ہو۔ پھر کیا کہنے ہیں؟ کتاب کے کیڑے صاحب کی آنکھ وہ ہے

سامنے ایک جیتی جاگتی دنیا کھل پڑتی ہے۔ کتب خانہ کا دلکشا کمرہ اس کمرہ کی نفیس
نفیس الماریاں اور ان الماریوں میں سجے کتاب کی پریوں کے جھرمٹ
سب جو اس کے سامنے سے نکل جاتے ہیں۔ جادوگر مصنّف فرض کیجئے
کہ کپ لنگ ہے اور اُس کی کتاب نولکھا، ہمارے کتاب کے کیڑے مطالعہ
فرما رہے ہیں۔ یہ مصنّف اپنے قلم کی چھڑی سے ایک خوبصورت تالاب
کے کنارے جہاں سنگِ مرمر کا چکنا چکنا ٹھنڈا ٹھنڈا فرش ہے ٹارون اور
سیتا بائی جیسی کی زندہ تصویریں کھڑی کر دیتا ہے۔ راجپوتانہ کا نیم شبی تاروں
بھرا آسمان اوپر ہے۔ کٹورا سا تالاب ہلکی ہلکی ملایم ملایم ہوا سے ایک طرف
جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ ٹارون کی سمندر کی سی نیلی نیلی اور سیتا بائی کی
ناگن کی سی کالی اور کٹار کی تیز دھار والی آنکھوں سے دو طاقتور نفوس
کی نفسیاتی فضائیں مکالمہ کی کھڑکیوں سے پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ جذبات
کے جوالا مکھ کی سرگرمی میں وقت کا بہاؤ کا احساس نہیں۔ اب کچھ دیر میں
پَو پھٹنے کو ہے۔ لیکن یہ دونوں پیکر خیالی ایک دوسرے کو قابو میں لانے کی
دُھن میں ہیں۔ آخر سیتا بائی کا ساتھی جگت سنگھ جو خواجہ سرا ہے تاریکی سے
نمودار ہو کر مگر دور سے چلنے کا اشارہ کرتا ہے اور اس وقت ٹاروں سیتا بائی
کے پہلو سے الگ ہوتا ہے۔ اغراض کے داؤ پیچ میں اس نے سیتا بائی
کی کمر میں ہاتھ حائل کر دیئے تھے اور یہ پتہ لگا لیا تھا کہ نولکھا ہار اس کی کمر میں
ہے ساتھ ہی اس دلربا ہستی کے تصادم سے جذبات کی بجلیاں عقل کو جلا کر
خاک کر دینا چاہتی تھیں۔ الگ ہوتے ہی طمنچہ کی نال کے زور پر ٹاروں نولکھا
ہار سیتا بائی سے لیتا ہے۔ ہار کے دیتے وقت سیتا بائی کی چمکیلی آنکھیں بجلیاں
بن جاتی ہیں اور جذبات کے ہیجان سے ابھرتے اور لرزتے سینہ کی چولی میں سے

پیش قبض کا زمرد رنگ جواہر نگار قبضہ دکھائی دیتا ہے اور ایک دفعہ ہی سیتا بائی اپنے گھوڑے کی طرف لپکتی ہے سوار ہونے سے پہلے اس کے ننھے ننھے مہندی لگے اور انگوٹھیاں بھرے ہاتھ سے پیش قبض تیر کی طرح ٹارون کی طرف لپکتی ہے اور ـــــ ٹارون ابھی گھوڑے پر بیٹھا نہ تھا۔ اس کے کندھے پر سے سائیں سے نکل کاٹھی ہیں جا بیٹھتی ہے۔ یہ قاتلانہ ادا ٹارون کو بے تاب کر دیتی ہے۔ گھوڑے پر اچک دم بھر میں ٹارون سیتا بائی کے برابر ہے جو ابھی گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکی ہے اور جھک سیتا بائی کی کولی بھر اچکا اُسے گھوڑے پر بٹھا دیتا ہے اور دونوں ننھے ننھے پیارے پیارے ہاتھ پکڑ یہ کہتا ہوا جھکتا ہے" اب ایک بوسہ " ـــــ اِتنے میں بنگلہ کی مرغی خانہ کا مُرغ اذاں دیتا ہے اور میاں کتاب کے کیڑے چونک پڑتے ہیں کیونکہ مُرغ کی اذاں کے ساتھ جیسا کہ شکسپیر نے لکھا ہے بھٹکتی ہوئی رُوحیں پھر اپنے اپنے ستھان لوٹتی ہوں یا نہ لوٹتی ہوں لیکن یہ صحیح ہے کہ خلاق دماغ کے پیدا کئے ہوئے خیالی پیکر تجر کی دیوی کی ملائم ملائم آہٹ کے ساتھ پھر الفاظ کا بھیس لے لیتے ہیں اور کتاب کی آغوش میں سو جاتے ہیں اور پھر کتاب کے کیڑے کو اپنی کتب بینی کی فردوس میں قدم رکھنے کے لئے بارہ گھنٹوں کی کٹھن منزل طے کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے اصلی کتاب کا کیڑا پن اور ایسے کتاب کیڑے کی اصلی کتب بینی۔
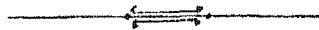
انسان فطرتاً متجسس پیدا ہوا ہے، تجسس، علم کی ترقی کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تعلیم یافتہ پبلک میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے کسی کتاب سے اس وقت تک کافی لطف نہیں اٹھا سکتے جب تک ان کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس کتاب کا مصنف کالا ہے یا گورا، موٹا ہے یا دبلا، نرم دل ہے یا آتش مزاج، شادی شدہ ہے یا مجرد، غرض کہ جب تک ان کے ذہن میں مصنف کی شکل و شباہت، عادات و خصائل کا نقشہ نہیں جم جاتا وہ کتاب کی خوبیوں کی بخوبی داد نہیں دے سکتے مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب کا ترجمہ ڈراما (علم دوست خواتین) ناظرین (رسالہ) نمائش کے سامنے پیش کرتے وقت اس تقاضائے فطرت کو تشنہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا گیا، پس لازم ہو گیا کہ فرانسیسی مصنف مولی ایر کے کچھ حالات ناظرین کے تفنن طبع اور واقفیت کی خاطر جمع کئے جائیں۔

مولی ایر کے حالاتِ زندگی

فرانس کا جلیل القدر کامِک نویس مولی ایر جنوری ۱۶۲۲ء میں سرزمین

پیرس میں نمودار ہوا اور کوئی پچاس سال تک اس دُنیائے فانی کی سیر کرتا رہا۔ اس کا باپ ژان پوک لین، فرش فرنیچر کی تجارت کیا کرتا تھا، مکانوں کی آراستگی وغیرہ کا کام بھی کر لیتا تھا۔ سا۱۶۳ء میں جب اُس کے چچا کا اِنتقال ہوا تو اُس کی خدمت اُسے ملی اور شاہی محلات کے فرش فرنیچر وغیرہ کی نگہداشت اُس کے سپرد ہوئی۔ مولیر کا تمام خاندان تجارت پیشہ تھا، اَدبی دلچسپیوں کا اُس کی طرح اور کوئی دلدادہ نہ تھا۔

اس کا نام دَراصل، ژان باپ تیست پوک لین تھا، مولیر، غالباً اُس نے تھیٹر کی خاطر ایک مختصر سا نام رکھ لیا تھا مگر یہ نام کیوں رکھا، اُس کی حقیقت اُب تک کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن بعد میں یہ نام اس کے خاندان کا نام ہوگیا۔ مولیر کی اِبتدائی تعلیم کی نسبت کچھ حالات معلوم نہیں، البتہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نوعمری میں وہ جیسوئیلٹ فرقے کے عیسائیوں کے زیرِ تعلیم رہا جنھوں نے دیگر علمی و عملی تعلیم کے ساتھ ایکٹنگ کی بھی رغبت دلائی، چونکہ وہ اِس فن سے فطرتاً لگاؤ رکھتا تھا، اُس لیئے بہت جلد اُس نے اِس میں کمال حاصل کر لیا۔

سا۱۶۴ء میں اُس نے کلیرمنت کالج کو خیرباد کہا، اُس کے زمانے میں فلسفہ کے لئے نصاب میں اَرسطو کی منطق، اَخلاقیات، طبیعات، مابعد الطبیعات وغیرہ شامل تھیں، لیکن کالج سے نکلنے کے بعد جب اُس نے ارسطو کا مخالف گیسندی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کئے تو اُسے لکریٹیس کے فلسفہ کی داد دینی پڑی۔

فلسفیانہ گفتگو کرنا اُس کی زندگی کا نہایت دلچسپ مشغلہ تھا اور یہی دلچسپی اُس کے اکثر ڈراموں میں نہایت وضاحت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ یہ فلسفہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہی تھا کہ اُس نے پنکلیس، مارفولیں، بلیز، ترسوتین،

فلاسنت، اور آر آند جیسے شیخی باز عالم نما ہستیوں کے حرکات وسکنات عادات واطوار کے رازوں کی کہنہ پائی۔

والد کی وفات کے بعد اُس نے کچھ عرصہ تک آبائی کاروبار چلایا، شاہی محلات میں بھی اپنے فرائض ادا کئے لیکن ۶ر جنوری ۱۶۴۳ء میں اُس نے شاہی خدمات کو استعفا دیا اور اسی سال ۲۸ر دسمبر کو مولیر نے جوزف بے ژارو میدلن بے ژار وجنویو بے ژارو وغیرہ کی شراکت سے ایک ٹینس کورٹ کرایہ پر لیا اور وہاں ایک اسٹیج قایم کرکے اپنی کمپنی کا نام للوستر تیاتر رکھا۔

خاندان بے ژارو کے اس تعلق نے مولی ایر کے نام کو جو دھبہ لگایا اور اُسکی زندگی کو جس طرح بدمزہ کیا، نہایت تکلیف دہ ہے۔ ان دوستوں کا باپ ایک جزوسعاش شخص تھا جس کے ذمہ کم ازکم اُس کے گیارہ بیٹے بیٹیوں کی پرورش تھی، میدلین بیژارو کو ایکٹنگ سے خاص دلچسپی تھی اور ایک ایکٹرس کی حیثیت سے وہ نہایت کامیاب عورت کہلانے کی مستحق ہے۔ وہ مولی ایر کی دوست (ممکن ہے کہ ان دونوں میں آشنائی بھی ہو) اور للوستر تیاتر کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ کے چکّر لگاتی رہی ہے۔ ۱۱ر فروری ۱۶۶۲ء کو مولی ایر نے ارمآند بے ژارد سے شادی کی تو اس کے دشمنوں نے خوب بے پر کی اُڑائی شروع کیں کہ مولی ایر کی بیوی میدلین بے ژارو کی بہن نہیں بیٹی ہے اور بعض نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا کہ چونکہ میدلین اور مولی ایر کے تعلقات رہ چکے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ ارمآند بے ژارو اسی کی بیٹی ہو۔ اس شرمناک من گھڑت قضیہ نے اتنا طول پکڑا کہ متعدد رسایل نے دورِ جدید کے سوانح نگاروں کو بھی اتنا دھوکا میں رکھا کہ وہ اس بے سروپا کہانی کو صحیح واقعات کی طرح درج کر گئے مولی ایر کے دشمنوں نے اس قضیہ پر جو تومار باندھے ہیں وہ ان کی خبث باطنی پر دال ہیں کیونکہ وہ

سب حسد کا نتیجہ اور سراسر لغو اور ہیچ پوچ دلایل پر مبنی ہیں اس لئے اُن پر تنقید کرنا ناظرین کے وقت کا خون کرنا ہے۔ اس جگہ اتنا اور لکھنا کافی ہے کہ اکثر سرکاری اور غیر سرکاری کاغذات سے یہ بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ ارماند بے ژارو میڈلن بے ژارو کی بیٹی نہ تھی بہن تھی۔

آمدم برسرِ مطلب، ۱۶۴۳ء سے مولی ایر نے مختلف ٹینس کورٹ کرایہ پر لیکر للوستر تیاتر کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، لیکن جب خالی تھیٹر کو تماشہ دکھانے کی نوبت آئی تو ۱۶۴۶ء میں مولی ایر نے پیرس کو خیرباد کہا اور اضلاع میں کام جمانے کی ٹھان لی۔

سفری تھیٹروں کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں ظاہر ہیں۔ اگر مولی ایر کے ساتھیوں کو اس کے ساتھ خلوص اور محبت نہ ہوتی تو اس کا تھیٹر کب کا ٹوٹ جاتا۔ تکالیف کچھ بھی سہی مگر یہ ضرور ہوا کہ مولی ایر کی آؤ بھگت پیرس کی بہ نسبت اضلاع میں بہت اچھی ہوئی اور کمپنی کی حالت سدھر گئی۔

۱۶۵۲ء میں اتفاقاً مولیر کے ہم مدرسہ شہزادہ کونتی سے بمقام لاگرینج مڈبھیڑ ہو گئی۔ شہزادہ مولیر کی ایکٹنگ سے بہت خوش ہوا اور اُس کی کمپنی کے نام پنشن جاری کر دی لیکن للوستر تیاتر کو بہت جلد اس پنشن سے ہاتھ دھولینا پڑا۔ کیونکہ ۱۶۵۶ء میں شہزادہ نے "اپنی زوح کی تیاری" شروع کی اور ناچ تماشہ کو گناہ تصور کرنے لگا۔

اب مولی ایر کو پیرس جانے کا خیال آیا قسمت نے مدد کی اور اس کو لوئی چہاردہم کے سامنے پہلی دفعہ ایکٹ کرنے کا موقع ملا۔ شاہی طبیعت تھی، تماشہ پسند آیا تو للوستر تیاتر کو پیرس میں ایک موزوں جگہ قایم کرنے کے لئے احکام جاری کر دیئے۔

ان احکام نے پیرس کے ایکٹروں اور مصنفوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ مولی ایر کے بھی قصائد نت کا تانتا باندھ دیا۔ غرض کہ " ٹلوستر تیاتر کی قسمت جاگی اور وہ آب و تاب کے ساتھ پبلک کو محظوظ کرنے لگا۔ حاسد گھات میں لگے بیٹھے تھے کہ مولی ایر نے ۱۶۶۲ء میں شادی کی اور ان کو اپنے دلوں کے جلے پھپھولے پھوڑنے کا موقع ملا۔ بادشاہ نے ان کے اس شرمناک فتنہ کا یوں جواب دیا کہ جب مولی ایر کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو وہ اس کا دینی باپ بنا۔

گو بادشاہ مولی ایر کا ساتھ رفیق صادق کی طرح دیتا رہا تاہم اس کی شہرت کے رقیب اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتے تھے روز ایک نئی تراش خراش کرتے اور پبلک کو اس سے منحرف کرانے کی کوشش میں غلطاں و پیچاں رہتے۔ اس نے بھی کئی طریقوں سے ان کے منہ توڑ جواب دیئے مگر وہ سب کو ہضم کر گئے۔ اور اپنے ساز و باز سے باز نہ آئے ۱۶۶۵ء میں بادشاہ نے مولی ایر کی کمپنی کو "شاہی کمپنی" ترو پ رو آ دو کا خطاب دیا اور دربار سے اس کے ایکٹروں کی تنخواہیں مقرر کر دیں اب دشمنوں کے حسد کا کیا پوچھنا، زمین پیروں تلے سے نکل گئی اور وہ اور بھی چراغ پا ہو گئے۔

لگاتار محنت کی تھکاوٹ اور زندگی کی شکایتوں نے ۱۶۶۶ء میں اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ اس کے دوست کے ۱۷ اپریل ۱۶۶۶ء کے روزنامچہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ مگر چونکہ چند دن اور جینا تھا طبیعت سنبھل گئی اور تصنیف اور ایکٹنگ کی وہی پہلی کی سی رفتار قائم ہو گئی ۱۰ اگست ۱۶۷۲ء سے پھر بیماری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ۱۱ اکتوبر کو بیٹے نے داغ مفارقت دیا غرض کہ نہایت تکلیف سے زندگی کاٹ رہا تھا کہ ۱۷ فروری ۱۶۷۳ء کو پھر ایک ڈرامے میں حصہ لینے کی سوجھی۔ نزلہ و بخار کا زور اور کھانسی کی شدت

تھی، مگر جس کام کے لئے کھڑا ہوا تھا کر کے ہی ہٹا البتہ پھر کبھی اسٹیج پر قدم نہ رکھ سکا۔ ایکٹنگ کے جوش میں مدہوش تھا کہ کھانسی نے ایک شریان پر اتنا بار ڈالا کہ وہ پھٹ گئی اور خون جاری ہو گیا۔ تماشہ ختم ہونے کے بعد رات کے وقت کوئی دس بجے اپنے پیرس کے مکان میں اپنی زندگی کی ٹریجڈی کا آخری ایکٹ دکھا کر دنیا اور دنیا والوں سے رخصت ہو گیا۔

اوس کے جنازے کے ساتھ نہ کوئی غیر معمولی بھیڑ تھی اور نہ کوئی جلوس ہی نکالا گیا تھا۔ پیرس کے آرچ بشپ نے تو اس کو عیسائی عقائد کے موافق دفن کرنے میں کوتاہی کرنی چاہی تھی مگر چونکہ بادشاہ مصر تھا اس لئے اسے سینٹ یوسیچ میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کی قبر پر ایک صلیب بھی نشانی کے لئے نصب کی گئی تھی لیکن اس وقت یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ سینٹ یوسیچ میں فرانس کا جید کامک نویس مولی ایر کونسے پتھر کے نیچے دفن ہے!

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

چال ڈھال اور خصائل

مولی ایر نہ موٹا ہی تھا نہ دبلا، اوسط درجہ کی جسامت کا آدمی تھا۔ اس کا قد اتنا چھوٹا بھی نہ تھا کہ پستہ قد کہا جائے کاٹھی کے جوڑ بند وں سے رعب داب ٹپکتا تھا۔ ٹانگیں سیدھی ہوئی تھیں۔ چلتا آہستہ آہستہ تھا۔ گندمی چہرے پر فکر و سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ ناک موٹی۔ منہ کشادہ۔ آنکھیں روشن اور نظریں اتنی تیز تھیں کہ لوگوں کے دلوں میں

اُتر جاتی تھیں۔ اَبرو سیاہ اور اتنے مطیع تھے کہ اسٹیج پر اُس کے اِشاروں پر چلتے اور اُسے مجسمۂ ظرافت بنا دیتے تھے۔

اُس کے اخلاق کی نسبت سب سوانح نگار یک قلم ہیں کہ نہایت خوش اخلاق آدمی تھا، ہر ایک کے ساتھ شرافت اور ملائمت کے ساتھ پیش آتا تھا، اُس کی راست بازی، دیانت داری، کشادہ دلی اور سخاوت کے اکثر قصے مشہور رہیں للوستر تیاتر کے ایکٹروں سے اُسے ہمدردی تو کیا محبت تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب اس نے اپنی علالت کے زمانہ میں اپنے ساتھیوں کو سُست اور بیکار بیٹھا دیکھا تو خود کام کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ غرض کہ اپنے ساتھیوں کی فلاح و بہبود کے خیال میں فنا ہو گیا۔ قیمتی فرنیچر زرق برق پوشاک اور قدیم کتابوں کا بھی اُسے شوق تھا۔

اَدبی تخمینہ

اَدبی حیثیت سے اُس کا درجہ، اُن ڈراما نویسوں میں جنھوں نے سماجی اور تہذیبی ڈرامے ظرافت بھرے الفاظ میں لکھے، غالباً سب سے بڑھا چڑھا ہے، فرانسیسی کامڈی کا تو باپ مانا جاتا ہے اس کی تصانیف کو اس زمانے کے فیشن، عادات واطوار اور ذوق شوق کی تاریخ اور انسانی زندگی کی نہایت سچی تصاویر سمجھنا چاہیئے۔ اور وہ بصیرت لے کر پیدا ہوا تھا جو ایک نظر میں جوش و جذبات کے خارجی نشانات کو بھانپ کر سطحات سے گزرتی ہوئی۔ دلوں کے پوشیدہ رازوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکال لیتی اور اصل اِنسان کو سمجھ جاتی۔ وہ اس قلم کا دھنی تھا جو مختلف جذبات اور ترنگوں کے حرکات وسکنات کو نہایت رنگین اور انمنٹ روشنائی سے

صفحۂ ہستی پر نہایت پُر لطف الفاظ میں لکھ جاتی اور کبھی لکھتے نہ تھکتی۔

اُس کے ذوقِ سلیم میں زندگی کی سچی قدر پنہاں ہے۔ ابھی وہ فانی انسانوں کے کارناموں پر ٹھٹھے لگا رہا تھا۔ ابھی اُن کی حالتِ زار پر ہمدردی کا اظہار کرنے لگا۔ کہیں رحم کے آنسو ہیں کہیں مذاق کے کہیں انسانی خود فراموشی اور خود غرضی پر تعجب بھرے دبے دبے پھٹے کے پھٹے رہ گئے ہیں۔

اگر اس کے ڈراموں کو صحیح مذاق کے ساتھ پڑھا جائے تو عجیب پُر لطف تجربہ کی باتیں معلوم ہونگی کیونکہ اُس نے موقتی غلط کاریوں کا دُکھڑا نہیں رویا ہے بلکہ فطرتِ انسانی کی وہ تصویریں کھینچی ہیں جن میں انقلابات کا خدشہ نہیں ہے۔ اُس کے ڈرامے پڑھنے میں وہی لطف اور دلچسپی ہے۔ جو دیکھنے میں چونکہ اُسے خدا داد سوجھ بوجھ کی قابلیت کے علاوہ، تھیٹر، ایکٹر اور منیجر کی ضروریات اور واقفیت کا کما حقہٗ علم حاصل تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ اس کے ڈرامے اسٹیج پر اور زیادہ محظوظ کریں۔ مگر اس کے ڈراماؤں کو اسٹیج پر لانا ہر شخص کا کام نہیں کیونکہ ان میں سوجھ بوجھ کا اتنا کام ہے کہ ناخواندہ ایکٹر سٹی بھول جائیں۔ وہی لوگ جو جوش و جذبات، غم و غصہ، ہنسی خوشی کو نفسیات کے نقطۂ نظر سے دیکھ چکے ہیں، مولی ایر کے نفسیات سے پُر ڈراموں کو پبلک کے سامنے پیش کرنے کی جراءت کر سکتے ہیں۔

سچ تو یوں ہے کہ بعض جگہ اُس کے خیالات اتنے گہرے اور پیچیدہ ہیں کہ سوائے سفید سر والے بوڑھوں کے اور کوئی اُن کی سچی تعریف بہ مشکل کر سکتا ہے جہاندیدہ لوگوں کے تجربے اُس کے مشاہدات سے مطابقت رکھتے ہیں اور انہی کے حافظے اُس کی خداداد قابلیت کی داد دیتے ہیں۔

فرانسیسی ادب میں تو مولیئر کا نام چوٹی پر نظر آتا ہی ہے۔ لیکن دنیا بھر کے

ڈرامہ نویسوں کی فہرست میں بھی اس کا دوسرا نمبر آتا ہے پہلا نمبر تو شکسپیر کے لئے وقف ہو چکا ہے۔ اب ناظرین کرام خود اندازہ فرمائیں کہ وہ مصنف کس پایہ کا ہے جس کی ایک بہترین کتاب کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

علم دوست خواتین

"علم دوست خواتین" مولیر کے ڈراما بیے فام سا وانت) کا ترجمہ ہے بجولائی ۱۶۷۲ء میں مولی ایر نے لکھا اور ایکٹ کیا تھا۔ اس ڈرامے کے لکھنے میں مصنف نے بہت دُور اندیشی اور خدا داد ظرافت سے کام لیا ہے اس میں اس نے نہایت پُر لطف پیرایہ میں چند پیرس کی بدلہ سنج ہستیوں، ذوقِ سلیم کے دعویداروں اور شیخی باز عالموں کا مذاق اڑایا ہے۔ فلامنت، ارماند، اور ترسوتین خاص طور پر دلچسپ کریکٹر ہیں "علم دوست خواتین" پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہہ اتنی عام ہستیاں ہیں کہ ان کو کسی خاص خطۂ زمین سے تعلق نہیں اور بہت تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ ہر آب و ہوا میں زندہ رہ سکتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس ڈرامے کا مضمون نہایت خشک معلوم ہوتا ہے مگر مولیر کے قلم نے جو اُن میں ظرافت کی جان ڈالی ہے وہ نہایت قابلِ داد ہے، واقعات اور جذبات کے موتیوں کو جس حُسن و خوبی سے پرویا ہے کچھ اہل نظر ہی تعریف کر سکتے ہیں۔ سینکڑوں نے اس کے چربے اتارنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب ہی رہے۔ یہی حالت مریض وہم مالا (اسے ماڑی ینیر) کی ہے جس کا ترجمہ مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب نے ہی کیا ہے۔ اُس میں حکیموں اور ڈاکٹروں کی بدلہ سنجی اور دھوکہ بازی کا عجیب پرلطف نقشہ کھینچا ہے۔

محمد عظمت اللہ خاں صاحب

مصنف کی نسبت اِتنا لکھ آنے کے بعد مترجم صاحب کی نسبت بھی کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب اِس وقت مددگار ناظم تعلیمات سرکار نظام ہیں۔ قسامِ ازل نے اُن کو حسن پرست دل عطا کیا ہے۔ جس میں حیاتِ بے پایان کے نظارہ کا شوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کائنات کی بوقلموں رنگینیوں کو وہ دقیقہ رس نگاہوں سے دیکھتے اور سطحیات سے گزر کر اصل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اِنسان کے نازک ترین حسیات، عزیز ترین تمناؤں پوشیدہ ترین مقاصد اور سربستہ اغراض کی کھوج پالینا اُن کی طبع رسا کا معمولی کام ہے۔ نہایت خوش اخلاق اور لطیفہ سنج طبیعت پائی ہے۔ کوئی اُن کی صحبت میں بیٹھ کر بردا شتہ خاطر اُٹھتا نظر نہیں آیا۔ اکثر یہی دیکھا ہے کہ جب کوئی اُن کے مکان سے نکلتا ہے تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کی سرخی جھلکتی رہتی ہے گفتگو ایسی پر لطف ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے خاں صاحب کہے جائیں اور ہم بیٹھے سنتے اور دل ہی دل میں اُن کی سلامت طبع کی داد دیتے رہیں۔ چونکہ آپ کو فلسفہ سے ایک خاص دلچسپی ہے اس لئے اثنائے گفتگو میں فلسفے اور نفسیات کے اکثر مسائل آجاتے ہیں مگر وہ اُن کو ایسے سادے اور لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ سامعین کو فلسفیانہ مضامین کے خشک اور تکلیف دہ ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ جہاں کسی شخص کو اُن سے ایک دفعہ ملنے کا اتفاق ہو گیا وہ یقیناً پھر اُن کی منکسر مزاجی اور خوش اخلاقی سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر اُنکے شکرہ بے وقت پر حملہ کر بیٹھے گا۔

ناظرین نمایش بارہا ان کی زبان کی شیرینی کے چٹخارے لے چکے ہیں۔ دلی کی پاکیزہ
اور شیریں زبان میں اپنی خداداد ظرافت سے جو لطافت وہ پیدا کرتے ہیں شاید ہی کہیں
اور اس کی مثال مل سکے وہ عام مضمون نگاروں کی طرح بھاری بھرکم الفاظ سے کام
نہیں لیتے۔ بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ پامال مضامین سے احتراز کرتے ہوئے فلسفے
اور نفسیات کے مضامین نظم و نثر میں لکھ جاتے ہیں۔ جذبات اور سراپا نگاری سے انکی
طبیعت کو خاص لگاؤ ہے۔ ظرافت کبھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی سنجیدہ ترین مضامین
میں بعض ایسے جملے آجاتے ہیں جو کبھی تو ناظرین کے دلوں میں چٹکیاں لے لیتے ہیں
اور کبھی گدگدی کر دیتے ہیں اظہار خیالات کی اُنھوں نے نئی نئی راہیں نکالی ہیں جو
دوسروں کے لئے صلائے عام کا کام دیتی ہیں۔ غرض کہ اُن کی داخلی اور خارجی کیفیات
سے پُر نظم و نثر صفحہ اُردو پر نئے نئے بوقلمون پھول کھلاتی ہے کہ مذاق سلیم کے متلاشی
اُن سے بہرہ در ہوں اور زبان اُردو کی سچی خدمت کر سکیں۔

وہ قدامت پسند نہیں لیکن اُن کے کلام میں قدیم زبان کی بھینی بھینی اور خوشگوار
بو ضرور آتی ہے۔ نظر انصاف سے دیکھا جائے تو ہندی بھاشا اور اُردو سگی بہنیں ہیں۔
فارسی اور عربی نے اُن کو بیگانہ بنانے کی کوشش کی اور کامیاب رہیں۔ مگر اُن بہنوں کو ایسی
سختی سے جدا کرنا کہ ایک دوسرے کی شکل بھی نہ دیکھ سکیں سراسر ظلم ہے۔ عظمت اللہ خاں
صاحب کوشاں ہیں کہ اِن بچھڑی ہوئی بہنوں کو پھر ملادیں اور ان دونوں میں جو شکر رنجی
ہو گئی ہے اُسے ایک حد تک دور کر دیں اگلی سی یکسانیت نہ سہی مگر کچھ تو رشتہ داری کی
باتیں آجائیں۔

ایک اور بات جو ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ "علم دوست خواتین" ایک
فرانسیسی جید مصنف کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ ترجمے کے مشکلات کا خیال رکھ کر ذرا اسے
شروع سے آخر تک پڑھ جائیے اور پھر خاں صاحب موصوف کی قادر الکلامی کی داد دیجئے۔

مرزا محی الدین بیگ

علم دوست خواتین

اشخاص ڈراما

کریسال	ایک خوش باش شہری
فلاسنت	کریسال کی بیوی
ارمانڈ آن ریت	کریسال اور فلاسنت کی بیٹیاں
اریست	کریسال کا بھائی
بلیس	کریسال کی بہن
کلتاندر	آن ریت کا عاشق
ترسوتین	ایک بذلہ سنج اہلِ قلم
وادیوس	ایک عالم
مارتین	ماما۔
لے پین	چھوکرا۔
جولیین	وادیوس کا نوکر
رجسٹرار۔	

سین۔ پیرس

ایکٹ پہلا

(سین پہلا)

ارماند - آنزیت

ارماند - تو بہن یہ کہئیے کہ کنوار پنے کے سندر نام، اس کے چین اور مزے سے ہاتھ اُٹھانا چاہتی ہو اور خوش خوش شادی کے دن کی راہ دیکھ رہی ہو۔ کیوں بہن یہ رذالاخبط تم پہ آخر سوار ہو ہی گیا۔؟

آنزیت - ہاں بہن۔

ار - ائے ہے۔ اس ہاں کہنے کے دیدے کو تو دیکھئے۔ اس ہاں کہنے کو کون سمجھ سکتا ہے جو سُننے اس کا جی متلائے۔

آن - بہن آخر شادی میں ایسی کیا بات ہے کہ تم . . . .

ار - خدا کی سنوار تمہیں کچھ شرم نہیں آتی۔

آن - یعنے؟

ار - یعنے کیا میں کہتی ہوں حیا بھی کوئی شئے ہے۔ کیا تم اتنی ننھی ہو کہ اس لفظ سے جو انسان کے دل میں گھن سی آنے لگتی ہے اُسے نہیں جانتی ہو۔"

سوچو اس سے دل میں کیسے بُرے بُرے خیال پیدا ہوتے ہیں۔ اُس سے دھیان کیسی گندگی کے دلدل میں جا پھنستا ہے کیا اس لفظ سے تمہارا جی تھرّا نہیں اُٹھتا۔؟ کیا بہن تمہاری چھاتی ٹھکتی ہے کہ اس لفظ کی کڑیاں بھی جھیلنے کو آمادہ ہو جاؤ۔

آن - میں جب اس لفظ کے پھل کا دھیان کرتی ہوں تو میری آنکھوں کے

سامنے میاں بچے اور ایک بسا بسایا گھر بیہر جاتا ہے اور ان میں مجھے کوئی ایسی بات
سمجھائی نہیں دیتی کہ ان کے بارے میں اگر سوچ سمجھ کر بات چیت کیا ئے
تو کسی کو برا لگے یا کسی کا دل تھرا اٹھے۔

ا ر - خدا کی پناہ کیا میاں بیوی بال بچوں کے جھمیلے بھی ریکھنے کے قابل ہیں؟

آن - میری اتنی عمر ہونے کو آئی اب اس سے زیادہ اچھی اور کیا بات ہو گی
کہ میں کسی مرد کے پلے بندھ جاؤں ایسے مرد کے جیسے میں بھی چاہوں اور جو
مجھے چاہے؟

۱ جہاں اس طرح دل ملجائیں وہاں گھر کی پاک زندگی کے مزے ملتے ہیں
کیا اس طرح کے بیاہ میں جہاں جوڑا موزوں ہو کوئی خوبی ایسی نہیں کہ
انسان ریکھے۔

ا ر - خدا بچائے بہن - تمہاری سمجھ کس قدر پست ہے - گھر کی کھکھیڑ میں پھنس
پھنسا کر کیا ہی بھلی لگو گی - بس میاں کی گڑیے کی طرح آؤ بھگت اور بچوں کے (شیطان)
لشکر میں جو کچھ مزا ملے گا اس کے سوا تمہارے نصیب میں اور کون سے مزے
رہ جائیں گے - یہ ذلیل باتیں اور زندگیاں معمولی رذیل لوگوں کے لئے ہی موزوں
ہیں - تم اونچی اور بڑی باتوں کا دھیان کرو - کوشش کرکے اعلیٰ سے اعلیٰ
کمال کا ذوق اپنے میں پیدا کرو - جو اصول کو سونپنے والی اور مادی باتوں کو
حقیر جانو اور اپنے آپ کو ہماری طرح ذہنی مشاغل میں ڈالدو تمہارے سامنے
اماں کی مثال موجود ہے - دیکھو ان کے علم و فضل کی دور دور دھوم ہے اور
شہرت ہے میری طرح تم بھی ان کی بیٹی بننے کی کوشش کرو - ان شائستہ
خوبیوں کے حاصل کرنے پر دھیان کرو جو ہمارے خاندان میں موجود ہیں اور
نفیس اور حسین چیزوں کے اس احساس کو اپنے میں جگاؤ اور نشوونما دو

جس کی کرنیں مطالعہ کے ذوق و شوق سے ہی دل میں پھیلتی ہیں بجائے اس کے کہ
مرد کے تحکمانہ اشارے پر بندر کی طرح ناچ ناچو۔ بہن فلاسفی کے پلے پڑ جاؤ۔ فلاسفی
نوع انسان سے بالاتر کر دیتی ہے عقل کا راج بٹھاتی ہے۔ حیوانی جذبات کو
اپنے قانون اور قاعدوں کا تابع کرتی ہے۔ کیونکہ ان جذبات سے متعلق
مکروہ خواہشات کو پست کر کے حیوانوں کی سطح پر پہونچا دیتی ہیں ہیں یہ سندر
خیالات۔ یہ ہیں مزیدار تعلقات جن سے زندگی کا کوئی لمحہ خالی نہ ہونا چاہیئے
جن بکھیڑوں میں بہت سی اچھی اچھی بیویاں مبتلا ہیں وہ ان ذہنی دلچسپیوں
کے آگے کیسی خفیف بے حقیقت سی باتیں نظر آتی ہیں۔

آن۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے اور یہ اس کی مرضی ہے کہ
ماں کے پیٹ سے ہی ہر ایک کو خاص خاص کام کے لیئے بنایا جاتا ہے۔ ہر آدمی
کا دماغ اس گون کا نہیں ہوتا کہ فلسفی بنجائے۔ اگر تم کو بہن ان آسمانوں کے لئے
جہاں فلاسفروں کے خیالات کی پہونچ ہوتی ہے بنایا گیا ہے تو مجھ غریب کو ان لئے
پیدا کیا گیا ہے کہ میں اس بھومی پر ہی رینگتی رہوں اور اپنے کمزور قویٰ سے
زندگی کے معمولی روزمرہ کے بکھیڑوں میں کام لوں۔

اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ اور منصفانہ بندوبست میں دخل در معقولات زیبا
نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ اپنے اپنے رجحانات کے بہاؤ کے مطابق چلیں۔ تم
اپنی زبردست طبع خداداد کے پر لگا کر حکمت کی فضاؤں میں اڑو میں اس
پست پر ہی ٹھہری رہوں اور شادی کے سبز باغوں کے مزے چکھوں اس
طرح ہم دونوں اپنے اپنے رنگ میں جدا جدا راستہ اختیار کر کے اپنی ماں کی پیروی
کرتے رہیں گے۔ تم روحانی اور بڑھیا خواہشات کے پہلو سے اور میں گھٹیا حواس
والی مسرتوں کے رخ سے تم روشن دماغی اور حکمت پیدا کرو گی اور میں بن گوشت

پوست کی مادی چیزیں وجود میں لاؤں گی۔

ار۔ یہ تم بھول گئیں کہ جب انسان کسی کی تقلید کرنی چاہتا ہے تو اس کی اچھی باتوں کی نقل کرتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ کسی کے کھانسنے کے ڈھنگ یا تھوکنے کے وتیرے کی نقالی کرے۔

آن۔ لیکن بہن جن باتوں پر تم اتنا ناز کرتی ہو یہ کہاں ہوتیں اگر ہماری اماں میں نری روح ہی روح ہوتی۔ اور بہن اس میں آخر تمہارا ہی بھلا ہوا کہ اماں کی اعلیٰ طبع خداداد سدا فلاسفی سے ہی ہم آغوش نہ رہی۔ میں استدعا کرتی ہوں کہ میری کمزوری پر چشم پوشی کی نظر ڈالو اور مجھ میں جو یہ مادی گھٹیا باتیں ہیں ان پر ناراض نہ ہو اور یہ فراموش نہ کرو کہ ان کی وجہ سے ہی خود تمہارا دنیا میں وجود ہوا۔ اس پر اصرار نہ کرو کہ میں تمہاری تقلید کروں اور اس طرح اگر کوئی ننھی علم دوست ہستی اس دنیا میں آنے والی ہے تو اسے آنے سے باز رکھوں۔

ار۔ یہ ظاہر ہے کہ دولہا کا خبط تمہارے دل سے نہیں نکل سکتا اچھا ذرا ہم بھی تو سنیں کہ کس سے آپ شادی کرنی چاہتی ہیں کہ کم از کم کلتاندر پر تو تمہاری نظر عنایت نہ ہونی چاہیئے؟

آن۔ کیوں نہ ہونی چاہیئے؟ کیا اس میں کسی بات کی کمی ہے؟ کیا اس جیسے بر کا انتخاب ٹھیک نہ ہوگا؟

ار۔ نہیں یہ بات نہیں۔ لیکن دوسرے کے مال غنیمت کو چھین لینا بے ایمانی اور حرمزدگی ضرور ہے ساری دنیا کو معلوم ہے کہ کلتاندر کھلم کھلا مجھ سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔

آن۔ ہاں بہن ٹھیک کہتی ہو۔ مگر کلتاندر کی آہیں اور گڑگڑانا تمہاری سرکار میں بے سود ثابت ہوا۔ کیونکہ تم اس انسانی کمزوری سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتی ہیں

تم نے اپنے سر سے اس سودے کو ہی نکال دیا ہے اور اپنا دل فلاسفی کے حوالے کر دیا ہے چونکہ کلتا ندر کی جانب تمہارے دل میں واقعی کوئی ایسا میلان نہیں ہے تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہے کہ کوئی اور اس کے دل پر قابو پالے ؟

ار۔ حواس ضرور عقل کے تابع ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے حسن کی پرستش کی مسرتوں سے بھی ہاتھ اٹھالے۔ عورت یہ کر سکتی ہے کہ ایک ہر طرح سے موزوں مرد کو شوہر تو بنائے نہیں۔ لیکن اس بات پر رضامند ہو جائے کہ وہ اس کے چاہنے والوں کے زمرہ میں شامل رہے۔

آن۔ تو میں نے کب اسے تمہارے کمالات کے مندر میں پوجا پاٹ سے روکا ہے میں نے اس کی مادی محبت کے نذرانے کو قبول کیا اور اس کو تم ٹھکرا چکی تھیں۔

ار۔ مگر میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ ایک ایسے شخص کے الفت کے دعویٰ پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے جسے اور طرف سے ٹکرا توڑ جواب مل چکا ہو؟ کیا تم یہ خیال کرتی ہو کہ اس کا میلان تمہاری جانب اس قدر قوی ہے کہ میری چاہ کی آگ اس کے دل میں بالکل بجھ چکی ہے ؟

آن۔ بہن اس نے تو یہی بیان کیا اور میں اس کے کہنے پر بلا تامل بھروسہ کرتی ہوں۔

ار۔ نہیں بہن۔ اس آسانی سے بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ جب وہ تم سے کہے کہ مجھ سے وہ دست بردار ہو چکا ہے اور تم پر جان چھڑکتا ہے تو بہن یہ سمجھو کہ اس کا در اصل منشا یہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔

آن۔ یہ تو میں جانتی نہیں۔ اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو اس پہیلی کی بوجھن کونسی مشکل بات ہے۔ لو وہ خود چلے آتے ہیں اور اس مسئلہ میں بخوبی

روشنی ڈال سکتے ہیں۔

[کلتا ندر آتا ہے]

سین دُوسرا

آن ریت ۔ کلتا ندر ایک شبہ دُور کرنے کے لئے جو میری بہن کی باتوں سے پیدا ہوا ہے۔ تمہارے صاف صاف جواب کی ضرورت ہے۔ اپنے دلی خیالات اور جذبات تمہیں ظاہر کرنے ہوں گے اور براہ مہربانی یہ بتلانا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے اب تمہارا دل کس کا ہے اور تمہاری محبت کا مستحق ہم دونوں میں سے کون ہے؟

ارمانڈ ۔ نہیں نہیں میں تمہاری محبت کو اقرار کی کسوٹی پر نہیں کسنا چاہتی مجھے اور دوں کے احساس کا بھی خیال ہے میں جانتی ہوں کہ اس قسم کا علانیہ اقرار کرنا آدمی کو کشمکش اور خلجان میں ڈال دیتا ہے۔

کلتا ندر ۔ نہیں میڈم مجھے جھوٹ یا فریب کی عادت نہیں اور مجھے سچ کہنے میں ذرا بھی خلجان نہیں ہوگا۔ اس قسم کی صاف گوئی مجھے کسی کشمکش میں نہیں ڈال سکتی۔ میں سچے دل سے اور بے کھوٹ نمیر سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ جن زنجیروں نے اب تک میرے دل اور میری رُوح کو اپنا قیدی بنا رکھا ہے وہ صرف ایک ہی ہستی کے عشق کی ہیں۔ اس صاف گوئی سے تمہیں تو کوئی اُلجھن ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ یہ صورت تمہارے منشا کے مطابق ہی ہے۔ تمہاری دلفریبیوں نے میرے دل کو ضرور موہ لیا تھا اور اس میری پرجوش محبت کا ثبوت میری درد بھری آہیں تھیں

میرا دل ہمیشہ کے لئے تمہارا ہونا چاہتا تھا۔ لیکن تمہاری نظروں میں یہ محبت کچھ زیادہ قابلِ التفات نہ تھی میں نے تمہاری محبت کا جوا گردن پر رکھکر بیسیوں خفتیں اُٹھائیں اور تمہاری آنکھوں نے بے دردِ مغرور جابروں کی طرح میرے دل پر حکمرانی کی۔ آخر آئے دن کے جبر و تعدی سے اکتا کر میں نے ذرا رحم دل فاتح اور ذرا ملائم زنجیروں کی جستجو کی۔ اور بیشک یہ چیزیں اُن آنکھوں میں مجھے میسر آئیں ان کی نگاہیں ہمیشہ میرے لئے انمول رہیں گی۔ ان کی نظروں سے جو ہمدردی ٹپکتی ہے اُس نے میری آنکھوں کو خشک کیا۔ اور ان آنکھوں نے اِس دل کو نہیں ٹھکرایا جیسے تم نے حقارت سے رد کیا تھا۔ اس الفت اور شفقت کا نتیجہ پر یہ گہرا اثر ہوا ہے کہ اب کوئی چیز ان میری زنجیروں کو توڑ نہیں سکتی اور ذرا جرأت کر کے تم سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ اب میرے جذبات کو اپنی جانب کھینچنے کی کوشش نہ کیجئے اور نہ اس دل کو اپنی طرف لوٹانے کی فکر کیجئے کیونکہ اب اس دل نے یہ ٹھان لی ہے کہ اس محبت کی آگ میں جو اب اِس میں لگ چکی ہے اپنے آپ کو پھونک دے۔

ا۔ خیر لو۔ سو یہ کس نے تم سے کہا کہ میری اس قسم کی خواہش ہے یا یہ کہ مجھے تمہاری اِس قدر لاگی ہوئی ہے؟ اس طرح تصور کر لینا تمہاری بے سمجھی پر دلالت کرتا ہے۔ اِس بات کو منہ پر لانا سخت گستاخانہ حرکت ہے۔

آ ن۔ بہن۔ اِتنی گرم کیوں ہوتی ہو کہاں ہے وہ روحانی قابو اور اخلاقی احساس جو حیوانی جذبات کی ہمیں بخوبی روک تھام کر سکتا ہے۔ اور رعونت کی منہ زوریوں کو مضبوط لگام دے سکتا ہے۔

ا ر۔ تم جو بڑھ بڑھ کر اخلاق کی باتیں بنا رہی ہو ان پر خود بھی چلتی ہو تمہارا تو خود یہ حال ہے کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کی مرضی کے بغیر تم سے محبت جتاتا ہے اور تم

اسے محبت بتاتا ہے اور تم جھٹ پٹ جواب میں اپنی الفت کا اظہار کر دیتی ہو۔ تم
ا کیا اتنا نہیں جانتیں ماں باپ کی اطاعت تم پر فرض ہے تم بغیر ان کی مرضی کے
کسی کو اپنا دل نہیں دے سکتیں تمہاری اُلفت پر ان کو پورا اختیار رہے اور
خود مختاری سے اپنا دل کہیں لگانا جرم ہے۔
آن۔ تمہاری اس عنایت کی شکر گزار ہوں کہ مجھے میرے فرض کی جانب توجہ
دلائی ہیں تمہاری نصیحت پر ہی چلونگی۔ لو بہن تمہارے اطمینان کی خاطر میں
کلتاندر سے تمہارے سامنے ہی کہے دیتی ہوں کہ جن لوگوں نے مجھے اس دنیا
میں بلایا اُن کی اجازت لیکر اپنی محبت کو مضبوط بنیاد پر رکھو و مجھے اپنی دلہن
بنانے میں اس وقت جیت سکو گے کہ ان کے باقاعدہ پروانہ کا ہتھیار حاصل
کر لو تاکہ مجھے بھی اس بات کا موقع ملجائے کہ تم سے بے کھٹکے محبت جتلا سکوں۔
کل۔ میں اس مقصد کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں گا مجھے اس بات کیلئے
صرف تمہارے اشارے کا انتظار تھا۔
ار۔ بہن تمہاری نگاہیں گواہ ہیں کہ تم اترا رہی ہو۔ تم اس خیال میں ہو کہ اس سے
مجھے اذیت ہو رہی ہے۔
آن۔ بہن میں اترا رہی ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے
دل پر عقل کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ حواس اور جذبات کی پیش نہیں جاتی۔
حکمت کا تم نے ایسا سبق پڑھا ہے کہ اس قسم کے خفیف اور رکیک احساسات
سے تم کہیں بلند ہو۔ مجھے تمہارے کسی طرح ناراض ہونے کا شبہ تک نہیں اس لئے
صاف دلی کے ساتھ میری یہ التجا ہے کہ اس معاملہ میں تم بھی میری طرفداری
کرو۔ کلتاندر کے پیام پر زور دو اور اس طرح تائید کرو کہ شادی کی خوشیوں والی
گھڑی جلدی آجائے۔ میں یہ ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں اور اس مدعا کے لئے ....

ار۔ تمہارا ننھا سا خالی خولی ذہن اپنے زعم میں طعن ترو زر کے مزے لے رہا ہے ایک ٹھکرایا ہوا دل کیا مِل گیا کہ تم اپنے آپے سے باہر ہوئی جاتی ہو۔

آن۔ ٹھکرایا ہوا سہی۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی کچھ بہت زیادہ اُسے ناپسند نہیں کرتی ہو۔ اگر تم اسے مجھ سے پھر چھین سکیں تو اس حرکت سے چوکتیں نہیں۔

ار۔ تم جیسی کے منہ لگنا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔ ایسی بیہودہ باتوں کا جواب خاموشی ہے۔

آن۔ یہ آپ کی بیحد نیکی ہے آپ نے ہمارے ساتھ رواداری اور چشم پوشی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

[ارماند چلی جاتی ہے]

سین تیسرا

آن۔ تمہارے صاف صاف کہہ دینے سے بہن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

کل۔ وہ اس کی سزاوار ہے کہ ایسے دندان شکن جواب دیا جائے۔ اس کے احمقانہ غرور اور اکڑ پر نظر کی جائے تو میری صاف گوئی بالکل حق بجانب تھی۔ ہاں۔ اب تم تو اجازت دے ہی چکی ہو میں تمہارے ابّا جان سے ملتا ہوں۔

آن۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ میری اماں جان کو پہلے ہموار کر لیا جائے۔ ابّا جان بڑے ہی نرم طبیعت کے ہیں لیکن یہ بھروسہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جس بات پر زبان دیدیں اُس کو بھی پورا کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی سرشت ایسی نیک

اور ملایم بنائی ہے کہ وہ اپنی بیوی کی مرضی کے تابع ہیں۔ اماں جان دراصل حکمران ہیں اور جب وہ ایک بات اپنے دل میں ٹھان لیتی ہیں تو پھر اُن کا حکم اٹل ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ اچھا ہوتا کہ تم اماں جان اور میری پھوپی سے ذرا زیادہ گھلو مِلو کرتے اس سے وہ پھول جاتیں اور تم پر نظرِ عنایت زیادہ ہو جاتی۔

کل۔ میری سرشت میں ضرورت سے زیادہ کھرا پن ہے میں نے تمہاری بہن کی اِن باتوں کی بھی کبھی تعریف نہیں کی جو تمہاری اماں اور پھوپی سے ملتی جلتی ہیں علم دوست خواتین کچھ میرے مذاق کے مطابق نہیں یہ ضرور ہے کہ میں ایسی عورت کو پسند کرتا ہوں کہ ہر مسئلہ کے متعلق اسے کچھ نہ کچھ واقفیت ہو لیکن مجھے ایسے علم و فضل کے شوق کی تاب نہیں جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ ہمیں لوگ صاحب علم و فضل سمجھیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ عورت بعض موقعوں پر اپنے آپ کو ایسی باتوں میں جن کو وہ جانتی بھی ہے جھوٹ موٹ جاہل بنالے یعنی وہ اپنے علم کو چھپائے۔ صاحب علم ہو لیکن دل میں یہ خبط نہ ہو کہ لوگوں پر اپنی علمیت جتائے۔ بات بات میں بڑے بڑے مصنفوں کے جملے نہ دہرائے موٹے موٹے لغت اور بھاری بھرکم فقرے نہ چھانٹے اور ذرا سا بہانہ پاکر اپنی ذہانت دکھلانے پر نہ تل جائے۔ میں تمہاری اماں جان کا بہت احترام کرتا ہوں مگر اُن کے تخیلات کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کر سکتا ہوں جب وہ اپنے علم و ذہانت کے دیوتا کے آگے جھکنے کی قائل ہوں۔ ان کی [illegible] کی متعلقہ باتیں سمجھ نہیں سکتا اور میرا ناک میں دم آجاتا ہے۔ وہ جب ایسے آدمی کا احترام کرتی ہیں تو مجھے غصہ آجاتا ہے اس کو بڑے مشاہیر ادب میں شمار کرتی ہیں حالانکہ وہ گدھا ہے اور اس کی اناپ شناپ تحریروں کا لوگ مضحکہ

اڑاتے ہیں۔ وہ ایک جھوٹ موٹ کا عالم اور فاضل ہے اور اس کے قلم کے رشحات اس کام آتے ہیں کہ دکانداران کے پڑے باندھیں۔

آن۔ میرا اور تمہارا مذاق اس معاملے میں ایک ہے مجھے خود موسو ترسوتین کی تحریر اور گفتگو اجیرن سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا اثر اماں جان پر بہت ہے ایسی صورت میں ذرا اس شخص کا زیادہ خیال رکھنا مناسب ہے۔ عاشق کو ان لوگوں کی بھی خاطر کرنی پڑتی ہے جو اس کی محبوبہ کے ارد گرد ہوں۔ ان سبھوں کو خوش کرنا پڑتا ہے تاکہ کوئی مخالفت نہ کرنے پائے۔ یہاں تک کہ گھر میں چاہیتا کتا بھی ہو تو اسے بھی ہلا لینا پڑتا ہے۔

کل۔ ہاں۔ کہتی تو سچ ہو پر میں کیا کروں اس ترسوتین کی صورت کے دیکھتے ہی میرے دل کے اندر ایسی نفرت پیدا ہوتی ہے کہ میں بے آپے ہو جاتا ہوں یہ تو کبھی نہ ہوگا کہ اپنی نظروں میں اپنے کو ذلیل کروں محض اس لئے کہ اس کی تصنیفات کو سراہوں اور اسے اپنا طرفدار بناؤں۔ اس کی ایک آدھ تحریر پڑھ کر پہلی دفعہ ہی مجھے اس کی جانب توجہ ہوئی میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی مگر اس کی تصنیفات نے مجھے اس سے بخوبی روشناس کر دیا اسکی بیہودہ تحریروں میں ساری وہی خرافات ہے جو وہ ہر جگہ اپنی علمی نمود کے شوق میں دکھلاتا پھرتا ہے۔ خود بینی اور ہر وقت کی بڑائی۔ تنگ خیالی اور خودستائی وہ انتہائی خود اعتمادی کی شان جو بے تکلف منہ سے اپنی ستایش کے پھول جھڑواتی ہے اور جس کی وجہ سے ہر اپنی تصنیف کے بارے میں وہ اعلیٰ رائے قایم کر لیتا ہے اور جس کے باعث اس کو ایک طرح کی شہرت ضرور حاصل ہو گئی ہے۔ اس شہرت پر وہ اس قدر جان دیتا ہے کہ ایک کامیاب جرنیل کے اعزاز اور ناموری سے بھی اس کو نہ بدلے۔

آن۔ تمہاری نظر بہت تیز ہے کہ ان باتوں کو پالیا۔
کل۔ میں نے اس کی کتابیں پڑھ کر اپنے دل میں اس کی صورت شکل قرار دے
لی ہے وہ جن اشعار سے لوگوں کی تواضع کرتا تھا ان کو پڑھ کر صاف معلوم
ہوتا تھا کہ یہ شاعر کس قسم کی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ میں نے اس کے خد و خال
ٹھیک ٹھیک قیاس کئے ایک دن باغ میں جو میں خود بدولت سے دو چار ہوا
تو میں نے فوراً اسے پہچان لیا میں شرط بد کر کہہ سکتا تھا کہ یہ حضرت ترسوتین
ہیں اور بعد کو معلوم ہوا کہ اگر کوئی مجھ سے شرط بدتا تو میں جیت جاتا۔
آن۔ یہ بھی خوب لطیفہ ہے۔
کل۔ میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ خیر۔ لو وہ تمہاری پھوپی اماں آرہی ہیں۔
اجازت ہو تو ان سے ہی پہل کروں اور تمہاری اماں جان کو خوش کرنے سے
پہلے ان کو اپنا طرفدار بنالوں۔

[آنریت چلی جاتی ہے]

سین چوتھا

کلتاندر

[بلیس داخل ہوتی ہے]

کل۔ میڈم۔ بڑی عنایت ہوگی اگر آپ دو ایک باتیں میری سن لیں اور
ایک چاہنے والے دل کو موقع دیں کہ وہ آپ سے اظہار کرے اپنی خالص
دل بستگی۔
بلیس۔ اے ہے ذرا دھیرے دھیرے۔ اپنے دل کا حال میرے سامنے

اگر میں نے تم کو اپنے حسن کے پرستاروں میں شامل کیا ہے تو بس اسے ہی کافی سمجھئے کہ آپ کی آنکھوں سے عشق ٹپکا کرے۔ اس آنکھوں والی زبان کے علاوہ اور الفاظ میں ایسی خواہشات اور جذبات کی وضاحت نہ کیجئے جن کو مجھ سے متعلق کرنا میں اپنی ذلت اور اہانت سمجھتی ہوں۔ آپ مجھ سے عشق کیجئے میرے لئے آہ و نالہ کیجئے اپنے روح کو میری دلفریبیوں کے پیچھے تڑپا کیجئے لیکن مجھے اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میں تمہارے اندرونی جذبات سے چشم پوشی کر سکتی ہوں اس وقت تک کہ آپ فطرتی زبان یعنے خاموش اظہار الفت کی حد تک ہی رہیں۔ اگر لب گویا اس معاملہ میں دخل دینے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر تمہیں اپنی نظروں سے دور کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔

کلتا۔ میرے دلی جذبات سے آپ گھبرائیں نہیں وہ میرے دل کو جس نے موہ لیا ہے وہ آنزبیت کا حسن ہے آپ سے میں صرف اس بات کا متمنی ہوں کہ اس کے حسن نے میرے دل میں جو عشق پیدا کر دیا ہے آپ اس کی تائید اور طرفداری کریں۔

ل۔ اوہو۔ میں مانتی ہوں کہ اس وقت کس چالاکی سے بات بنائی ہے۔ ایسی نزاکت سے پیترا بدلا ہے کہ آفریں ہے۔ میں نے بھی بیسیوں ہی ناول پڑھے ہیں لیکن ایسی انوکھی چال کہیں نظر سے نہیں گزری۔

کلتا۔ میڈم اس میں کوئی ذہنی داؤ پیچ کی بات نہیں میں نے اپنے اصلی احساسات کا اظہار کیا ہے غیب سے میرا دل آنزبیت کی دلربائیوں میں اس طرح گرفتار ہو گیا ہے کہ اب اس جال سے نکلنا ممکن نہیں آنزبیت میرے دل کی مہربان ملکہ ہے اور میری بڑی آرزو یہ ہے کہ آنزبیت سے بیاہ ہو جائے۔ آپ اس نیک کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں اور میری آپ سے صرف یہ درخواست ہے کہ آپ میرے پیام کی تائید کریں۔

ل۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کی درخواست کا کنایہ کس جانب ہے۔ میں جان گئی کہ آپ کی اس نام کے پردے میں دراصل کیا مراد ہے۔ یہ استعارہ آپ کی ذہانت کا پتہ دیتا ہے۔ میں اس استعارہ کی آڑ ہی میں اپنے دل کی بات آپ سے کہے دیتی ہوں۔ میرا جواب یہ ہے کہ آتریت تعلق زن وشو سے نفرت کرتی ہے۔ اگر تمہارا دل اس خواہش میں جل کر راکھ بھی ہو جائے تو بھی اس سے منھ دھو رکھو کہ اس کی جانب سے تمہیں کوئی اچھا صلہ مل سکے۔

کلتا۔ میڈم۔ آخر باتوں کے اس طرح توڑنے مروڑنے سے کیا حاصل۔ کیوں آپ کو اس بات کے ماننے پر اصرار ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

ل۔ خدا کے لئے۔ آپ تکلف سے کام نہ لیجئے۔ اور ان باتوں سے انکار نہ کیجئے جو آپ کی نگاہیں مجھ سے کہہ چکی ہیں۔ بس یہ کافی ہے کہ میں اس چال سے جو تمہارے عشق نے بڑے کمال کے ساتھ تمہیں سجھائی ناراض نہیں ہوں۔ احترام نے تمہیں اس پر مجبور کیا کہ استعارہ کے پردے میں بات چیت کیجائے اور میں اس حد تک آمادہ ہوں کہ تمہارے اظہار عشق کو سہہ لوں مگر ایک شرط ہے کہ یہ تمہاری فرط محبت کی بے تابی شرافت پر مبنی ہو اور تم میرے حسن کی دیوی پر ایسے روحانی جذبات کا نذرانہ چڑھایا کرو۔

کلتا۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ل۔ خدا حافظ۔ فی الحال اتنی باتیں ہی بہت ہیں میں اتنا بھی کہنا نہیں چاہتی تھی مگر خیر بات میں بات نکل آتی ہے۔

کلتا۔ لیکن تمہاری غلط فہمی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ل۔ بس اب ختم کیجئے۔ میرے چہرے سے شرم ٹپکی جھلک رہی ہے۔ میری حیا داری نے اتنا بھی جو سہا وہی بہت ہے۔

کلتا۔ جہنم میں جاؤں جو تم سے شمہ برابر بھی محبت میرے دل میں ہو۔ سمجھداری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بل۔ نہیں نہیں میں اب کچھ سُننا نہیں چاہتی۔ [چلی جاتی ہے]

کلنتا۔ یہ ناسمجھ عورت اور اس کے خیالی پلاؤ سے شیطان بچائے۔ اس درجہ حماقت کسی نے کبھی دیکھی نہ سُنی ہوگی میں اپنے معاملہ کو کسی اور سمجھدار آدمی کے سپرد کروں تو بہتر ہوگا۔ اور اسی کے مشورے پر کاربند رہوں۔

ایکٹ دوسرا

سین پہلا

اریست۔ کلنتا ندر سے رخصت ہوتے ہوئے۔

اریس۔ ہاں ہاں میں جہاں تک ممکن ہوگا جلد ہی جواب لاؤں گا میں زور دوں گا میں اصرار کروں گا جو کچھ مجھ سے ممکن ہوگا کر گذروں گا۔ (کلنتا اندر جاتا ہے) جن پر عشق کا بھوت سوار ہو جاتا ہے وہ صرف ایک لفظ "ہاں" کے لئے کتنی اور کیا کیا باتیں بگھارتے ہیں! اور پھر اپنے مقصد کے لئے اُن کی بے صبری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

سین دُوسرا

(کریسال۔ داخل ہوتا ہے)

اریس۔ آہا! بھائی۔ خدا تمہیں اچھا رکھے۔

کر۔ اور تمہیں بھی جیتا رکھے۔

اریس۔ کچھ خبر بھی ہے میں کس مطلب سے آیا ہوں؟

کر۔ نہیں البتہ میں سُننے کا مشتاق ہوں۔ کہئے تو بات کیا ہے۔

اریس۔ آپ کلنتا ندر کو تو مدت سے جانتے ہیں؟

کری۔ خوب جانتا ہوں۔ وہ اکثر ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔

اریس۔ بھائی آپ کی ان کے متعلق کیا رائے ہے۔

کری۔ ان کے نسبت میرا خیال ہے کہ وہ عزت دار طباع جری اور کھرے آدمی ہیں۔ میرے جانب کاروں میں شاید ایک آدھ ہی آدمی ان خوبیوں کا نکلے۔

اریس۔ اُن کی ایک آرزو مجھے یہاں تک لائی ہے۔ اور بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا ان کی نسبت ایسا عمدہ خیال ہے۔

کری۔ میں روم جارہا تھا اثنائے سفر میں اُن کے والد مرحوم سے شناسائی ہوئی۔

اریس۔ خوب۔

کری۔ اُن کے والد نہایت ہی بھلے آدمی تھے۔

اریس۔ میں نے بھی اُن کی تعریف سنی ہے۔

کری۔ ہم دونوں کا سن برابر کا تھا بس اُٹھائیس سال اور یقین مانو ہم دونوں کے دونوں منچلے نوجوان تھے۔

اریس۔ بے شک ہوں گے۔

کری۔ رومی خواتین نے ہم دونوں کے دلوں پر بجلیاں گرائیں اور ہماری دلگیوں کا اس جگہ چرچا ہو گیا تھا۔

بہت سے دلوں میں ہم نے رقابت کی آگ بھڑکا دی تھی۔
اریس۔ بھلا اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ لیکن آپ اس معاملہ کی طرف آئے جس کی وجہ سے میں اس وقت آپ کے پاس آیا ہوں۔

سین تیسرا

(بلیس داخل ہوتی ہے)

اریس۔ کلتا ندر نے مجھے اپنا وکیل بنایا ہے اس کے دل کو آنزیت کے حسن نے گرویدہ کر لیا ہے۔
کری۔ ہائیں۔ آنزیت کے حسن نے!
اریس۔ جی ہاں۔ کلتا ندر اس کا والہ و شیدا ہو گیا ہے، میں نے ایسا وارفتہ عاشق کبھی نہیں دیکھا۔
بل۔ نہیں نہیں بات یہ نہیں ہے۔ اب تو میں نے سن بھی لیا اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اس نسبت کی آپ کو خبر ہی نہیں۔ معاملہ کچھ اور ہے آپ سمجھے ہوئے ہیں کچھ اور۔
اریس۔ بہن یہ کیسے؟
بل۔ کلتا ندر تمہاری آنکھوں میں خاک ڈال رہا ہے اس کا دل کہیں اور سے لگا ہوا ہے۔
اریس۔ بہن تم بھی دلگی کر رہی ہو۔ کیا آنزیت سے اسے الفت نہیں ہے؟
بل۔ نہیں مجھے اس کا پورا یقین ہے۔

اریس۔ مگر اس نے تو مجھ سے خود کہا ہے۔
بل۔ ہاں کہا ہوگا کہنے سے کیا ہوتا ہے۔
اریس۔ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ اس نے مجھے بھیجا ہے کہ آج ہی میں لڑکی کے والد کو پیام دیدوں۔
بل۔ ہاں یہ ٹھیک سہی۔
اریس۔ محبت میں اس قدر بیتاب ہے کہ اس نے بڑے اصرار سے درخواست کی ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس نیک کام کی جلدی ہی تکمیل ہو جائے۔
بل۔ بہت بہتر بات ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا عاشقانہ چال ہوسکتی تھی۔ بھائی یہ بات بس اپنے ہی تک رکھنا۔ آنزیت کا تو محض ایک بہانہ ہے۔ ایک چالاکی کی ٹٹی، ایک فریب ہے۔ اس نام کے پردہ میں تو کسی اور کی لگی ہوئی ہے اور مجھے اس کی خبر ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ دونوں کی غلط فہمی دور کردوں۔
اریس۔ جب تمہیں اتنا کچھ معلوم ہے تو پھر کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ وہ اصلی محبوبہ کون ہے؟
بل۔ کیا واقعی آپ جاننا چاہتے ہیں؟
اریس۔ ہاں وہ کون ہے؟
بل۔ وہ میں ہوں۔
اریس۔ تم؟
بل۔ ہاں میں۔
اریس۔ توبہ توبہ بہن۔

بل: توبہ توبہ، کے کیا معنے؟ میں نے کون سے اچنبھے کی بات کہی؟ میری صورت اچھی خاصی ہے اور اسی کی بدولت ایک چھوڑ کئی دل میرے زیرنگیں ہیں؟ دورانت۔ وایس۔ کلیونت۔ اورلسی داس اس کے گواہ ہیں کہ مجھ میں دلربائیاں موجود ہیں۔

اریس۔ یہ حضرات کیا تمہیں چاہتے ہیں؟

بل۔ ہاں تہ دل سے۔

اریس۔ انھوں نے تم سے یہ بات ظاہر بھی کی؟

بل۔ کس کی مجال ہے کہ ایسی جسارت کرسکے۔ وہ اب تک اس قدر تعلیم و تکریم سے پیش آتے رہے ہیں کہ محبت کا ذکر زبان پر لانے کی جرات ہی کہاں ہوسکتی ہے۔ لیکن بے زبان دل کی ترجمانی کرنے والی علامتوں نے اپنا کام کیا اور ان کے دل میری نذر کردیئے۔ اور ان کی باطنی پرستش کا اقرار کیا۔

اریس۔ دایس بیچارہ تو گھر کے اندر کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے۔

بل۔ اس سے انتہائی عجز و احترام دکھانا مقصود ہے۔

اریس۔ دورانت سدا تم پر طعن آمیز فقرے کسا کرتا ہے۔

بل۔ یہ اس کی دیوانہ وار رقابت کی ہذیان سرائی ہے۔

اریس۔ رہے کلیونت اور لسی داس، دونوں نے شادی کرلی۔

بل۔ یہ اس لیئے کہ میں نے دونوں کی محبت کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مایوسی کی حد تک پہونچا دیا۔

اریس۔ بہن واقعہ یہ ہے کہ یہ محض تمہارے خیالی پلاؤ ہیں۔

کرہی۔ تم کو اس قسم کے خیالی پلاؤ دل سے نکال دینے چاہیں۔

بل۔ اُے ہائے۔ تم دونوں اُن کو خیالی پلاؤ کہتے ہو۔ کیا واقعات بھی کہیں من گھڑت ہو سکتے ہیں واقعات کو خیالی پلاؤ کہنا! کیا خوب! پیارے بھائیو میں اِس خیالی پلاؤ کے دل سے مزے لیتی ہوں۔ مجھے اب تک اس کی خبر نہ تھی کہ میں بھی خیالی پلاؤ کھاتی ہوں۔

[چلی جاتی ہے]

سین چوتھا

کریپال ←——→ اریس

کری۔ ہماری بہن کا یقیناً دل اُلٹ گیا ہے۔

اریس۔ اور اس میں روز زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ خیر۔ بھائی پھر اصل معاملہ پر غور کریں۔ کلتا ندر کی درخواست ہے کہ آنریت سے اس کا عقد کر دیا جائے اس کے پیام کا کیا جواب دینا ہوگا؟

کری۔ اس میں بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے میں دل سے راضی ہوں اور اس پیوند کو فخر کی بات سمجھتا ہوں۔

اریس۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ دولت اس کے پاس ضرورت سے زیادہ نہیں ہے کہ . . . .

کری۔ یہ کوئی قباحت کی بات نہیں۔ اس کی دولت اس کی نیکی اور شرافت ہے۔ اور یہ چیزیں دولت سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اس کے والد اور ہیں ایک جان دو قالب ہیں۔

ارلیس ۔ اچھا تو بھائی ۔ اب بھاوج سے اس بارے میں بات چیت ہو جانی چاہیئے ۔ اور ان کو بھی رضا مند کر لینا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کریی ۔ بس یہ کافی ہے کہ میں اسے اپنی فرزندی میں لیتا ہوں ۔

ارلیس ۔ یہ درست ہے ۔ لیکن بھائی تمہاری رضا مندی کو تو بھابی کی پسندیدگی سے اور تقویت ہو جائے گی ۔ آؤ چلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کریی ۔ بھائی تم مذاق کر رہے ہو اس کی ضرورت ہی نہیں میں اپنی بیوی کا ذمہ لئے لیتا ہوں کل معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ۔

ارلیس ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کریی ۔ بس مجھ پر چھوڑ دو اور کوئی ڈر کی بات نہیں ۔ لو میں ابھی جاتا ہوں ۔ اس خوش خبری کو سنائے دیتا ہوں ۔

ارلیس ۔ بہت خوب ۔ میں تمہاری آنزیت کا دل ٹٹولتا ہوں اور پھر تمہارے پاس ہی خبر لینے کو واپس آؤں گا ۔

کریی ۔ اس بات کو تو یوں سمجھو کہ طے ہو چکی میں ابھی اپنی بیوی سے اس بارے میں بات چیت کئے لیتا ہوں ۔

[ارلیس چلا جاتا ہے ۔ مارتین روتی داخل ہوتی ہے]

سین پانچواں

مارتین ــــــــــ کریسال

مار ۔ میرے بھی کیا کھوٹے کرم ہیں ۔ ہائے ! یہ کہاوت سچی ہے "رسکتے کی جان لینی ٹھہری تو دوانہ مشہور کر دیا" نوکری بھی کیا ہی بری بلا ہے ۔

کری ۔ کیا ہوا ؟ مارتین تجھ کو کیا ہوا ؟
مار ۔ مجھ کو کیا ہوا ؟
کری ۔ ہاں اور کیا پوچھتا ہوں ؟
مار ۔ ہوا کیا ۔ مجھے جواب دیدیا ۔
کری ۔ تجھے جواب دیدیا ۔ ؟
مار ۔ ہاں میم صاحب نے نکال باہر کیا ۔
کری ۔ آخر کیوں نکال باہر کیا ؟
مار ۔ اور یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر میں یہاں سے نہیں ٹلوں گی تو مجھے مار پٹوائی جائے گی ۔
کری ۔ نہیں تجھے کون نکال سکتا ہے ۔ میں تیرے کام سے خوش ہوں میری بی بی ذرا مزاج کی تیز ہیں اور میں نہیں چاہتا ۔ . . . .
[فلامنت اور بلیس آجاتے ہیں ۔]

سین چھٹا

فلامنت ۔ بلیس ۔ کریبال ۔ مارتین

فلا ۔ کیوں ری قطامہ ! تو ابھی دفعان نہیں ہوئی چلو ۔ منہ کالا کرو ۔ چوٹی کہیں کی ۔ نکلو میرے گھر کے باہر ۔ اور خبردار جو کبھی مجھے اپنی صورت دکھلائی ۔
کری ۔ ہائیں ۔ ہائیں ۔ اتنی تیز کیوں ہوتی ہو ۔
فلا ۔ بس میں نے قصہ پاک کر دیا ۔

کری۔ ہائیں۔ ہائیں!
فلا۔ میں نے ٹھان لی ہے۔ کہ اب اسے نہیں رکھوں گی۔
کری۔ لیکن اوس کی کوئی تقصیر بھی تو معلوم ہو۔؟
فلا۔ ہاں تو آپ اس کی حمایت کرتے ہیں۔؟
کری۔ مطلق نہیں۔
فلا۔ کیا میرے مقابلے میں اس کی طرفداری۔؟
کری۔ توبہ! طرفداری کون کرتا ہے۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ اس نے کیا کیا۔
فلا۔ کیا مجھ سے یہ ممکن ہے۔ کہ بغیر کسی معقول وجہ کے اس کو نکال دوں۔
کری۔ میں یہ کب کہتا ہوں لیکن ہمارے نوکر بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
فلا۔ نہیں۔ اسے کھڑے کھڑے نکالوں گی، چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔
کری۔ ہاں ہاں نکالو۔ تمہیں منع کون کرتا ہے۔
فلا۔ میرے کام میں کوئی روڑا اٹکے تو اس کی مجھے مطلق برداشت نہیں۔
کری۔ منظور۔
فلا۔ اور تم اگر سمجھ دار شوہر ہوتے تو میرا ساتھ دیتے اور میرے غصہ میں شریک ہوتے۔
کری۔ میں تمہارے ساتھ ہی تو ہوں۔ اری قطامہ میری بی بی نے ٹھیک کیا کہ تجھے نکال باہر کیا تیری تقصیر معافی کے قابل نہیں۔
مار۔ آخر میں اپنی تقصیر بھی تو جانوں؟

کری۔ جو چاہے قسم لے لے جو مجھے ذرا بھی خبر ہو کہ تو نے کیا گناہ کیا ہے۔
فلا۔ اس کی ڈھٹائی تو دیکھو اپنا قصور ہی نہیں جانتی۔
کری۔ کیا اس نے تمہارا آئینہ یا کوئی چینی کا برتن توڑ ڈالا ہے کہ تم اتنی خفا ہو۔
فلا۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ اتنی سی تقصیر پہ مجھے غصہ آتا ہے۔
کری۔ تو کیا اس سے اور کوئی بڑی تقصیر ہوئی۔
فلا۔ ہاں ہاں کیا مجھے نا سمجھ عورت سمجھ رکھا ہے۔
کری۔ کیا اس کی غفلت سے چاندی کی قاب یا پیالہ چوری گیا۔
فلا ــــــ میں تو اس سے بھی درگزرتی۔
کری ــــــ ارے تو میری نیک بخت! پھر ہے کیا؟ کیا تم نے اسے چوری کرتے پکڑا۔
فلا ــــــ اس کا قصور اس سے بھی بد تر ہے؟
کری ــــــ اس سے بھی بد تر ہے۔
فلا ــــــ ہاں بد تر ہے۔
کری۔ ــــــ تو وہ ہے کیا؟ اس عورت سے خدا سمجھے۔ ارے کیا اس نے . . . .
فلا ــــــ سنا چاہتے ہو تو لو سنو! اس کا قصور یہ ہے کہ بیسیوں دفعہ پڑھایا اور پھر بھی یہ میرے کانوں کو اپنی شئیلنت سے صدمہ ہی پہنچاتی ہے لاکھ دفعہ کہا کہ اہل زبان نے جس لفظ کو سوقیانہ اور مخش قرار دیا ہے اور جس کی بیحد برائی کی ہے وہ لفظ میرے سامنے منہ سے نکلنے نہ پائے۔ مگر یہ جان کر کہتی ہے۔

کری ـــــ کیا یہ . . . .

فلا ـــــــ اس کی ڈھٹائی تو دیکھو اتنا اتنا جتایا اور پھر بھی گرامر کی بیخ کنی کرتی ہے۔ گرامر ساری علوم کی بنیاد ہے اور اس کی حکومت بادشاہوں پر ہے اور وہ بھی اس کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔

کری۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں سمجھتا تھا کہ اس سے کوئی گناہِ کبیرہ سرزد ہوا ہے۔

فلا۔ تو کیا تم اس جرم کو ناقابل معافی نہیں سمجھتے؟

کری ـــــ یقیناً سمجھتا ہوں۔

فلا ـــــ نہیں، تمہارا جی چاہے تو ذرا اسے معاف کر دیکھو؟

کری ـــــ میرا تو ایسا ارادہ نہیں ہے۔

بل ـــــ واقعی اس کی باتیں سرپیٹ پیٹ لینے کے قابل ہیں۔ زبان کی ساخت اور ہر قانون قاعدے کا ستیاناس کرتی ہے۔ حالانکہ اسے بیسیوں دفعہ سمجھایا اور جتایا۔

مار ـــــ تم جو بڑی بڑی باتیں بناتی ہو وہ بڑی سہی۔ مجھے کتنا ہی سکھاؤ پڑھاؤ۔ مجھے تمہاری لکھی پڑھی بکواس کبھی نہیں آئے گی۔

فلا ـــــ گستاخ۔ ایسی زبان کو جس کی عمارت عقل اور شائستہ طور پر کھڑی کی گئی ہو یہ گستاخ بکواس کہتی ہے۔

مار ـــــ میں تو زبان یہ جانوں ہوں کہ اپنا مطلب سمجھا دیا۔ تمہاری ہی چکنی چپڑی باتوں سے جو لڈو پیڑے ملتے سو ہتی انہیں ملیں۔

فلا ـــــ لو اور سنو۔ یہ ایک اور مثال ہے "ہتی نہیں ملیں"۔

بل ـــــ اری دیوانی۔ کیا تجھے خدا نے بھیجا ہی نہیں دیا؟ میں تیرے ساتھ کتنا مغز مارتی ہوں اور تو پھر بھی اپنی زبان ٹھیک نہیں کرتی۔ اور نہیں

بے ضرورت نہیں۔ تجھے پہلے جتا چکی ہوں کہ اسے دہری نفی کہتے ہیں۔

مار ـــــ یا اللہ تیری پناہ۔ میں نے کچھ تمہاری طرح پڑھا لکھا تھوڑی ہے ہماری تو دیسی ہی بولی ہے جیسی ہم جیسا آدمی بولتے ہیں۔

فلا ـــــ یا الٰہی میں نہیں سہہ سکتی۔

بل ـــــ کس بری طرح قاعدے کی ٹانگ توڑی ہے۔

فلا ـــــ انسان کے کان کے پردے پھاڑ دینے کو یہ کافی ہے۔

بل ـــــ تو بڑی ہی کوڑ مغز ہے آدمی واحد کا صیغہ ہے (بولتے ہیں) فعل جمع ہے کیا عمر بھر تو گراں میر (گرامر) کا یوں ہی خون کرے گی۔

مار ـــــ لو ذرا ہوش میں آؤ مجھ پر اب خون کا الزام لگاتی ہو میں نے کب کسی کی گراں میر (دادی) یا گراں پیر (دادا) کا خون کیا ہے۔

فلا ـــــ یا اللہ یہ تیرا قہر ہے۔

بل ـــــ اری کمبخت گراں میر کے تو نے غلط معنی لئے ہیں میں تجھے پہلے ہی سمجھا چکی ہوں کہ یہ لفظ کہاں سے آیا ہے۔

مار ـــــ یا میرے اللہ یہ لفظ روم سے آوے یا یونان سے مجھے اس سے کیا۔

بل ـــــ کیسی گنوار عورت ہے! اری کند ذہن گرامر فعل اور فاعل کے قاعدے بتلاتی ہے۔ اور اسم کا اسم صفت سے رشتہ ظاہر کرتی ہے۔

مار ـــــ پڑی بنایا کرے۔ میں تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔

ـــ (نوٹ) فرانسیسی میں ان لفظوں کا گرامر (   ) دادی (   ) کا تلفظ گراں میر ہے اور اسی سے یہ لطیفہ پیدا ہو گیا ہے اس کا اردو میں مقابل ترجمہ ممکن نہیں۔

فلا ــــــ اس کی باتوں سے تو انسان کا دل الٹ جائے۔

بل ــــــ اری سٹرن یہ لفظوں کے نام ہیں اور یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس طرح ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں۔

مار ــــــ مجھے اس کی کیا دگدا پڑی ہے کہ ایک دوسرے سے میل کھائیں یا پہاڑ کھائیں۔

فلا ــــــ (نند سے) بس خدا کے لئے اس حجت کو ختم کرو (اپنے شوہر سے) تو تم اس کو جواب نہیں دو گے؟

کری ــــــ ہاں ہاں دونگا کیوں نہیں (مارتین سے) اس وقت خبط سوار ہے۔ چپکی ہو جا۔ جا۔ ورنہ اور جھلائیگی (پکار کر) مارتین نکل جا یہاں سے۔

فلا ــــــ خوب۔ تم اس زبان دراز کو ناراض کرتے ڈرتے ہو۔ اس طرح باتیں بنا رہے ہو گویا دم نکلا جاتا ہے۔

کری ــــــ (علیحدہ) ہیں اور اس سے ڈروں توبہ کرو (مارتین سے) جا بیٹی بھاگ جا۔

[مارتین چلی جاتی ہے ۔]

سین ساتواں

فلامنت ۔ کریسال ۔ بلیس

کری۔ لو جو تم چاہتی تھیں وہی ہوا اب تو دل ٹھنڈا ہوا اگر کہے دیتا ہوں

کہ مجھے اس کا نکالنا منظور نہیں۔ وہ اپنا کام دل لگا کر کرتی ہے اور تم ہو کہ ایک ذراسی بات پر اسے نکال باہر کرنے پر اڑی ہوئی ہو۔

فلا ۔ —— صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں اسے اپنے گھر میں رکھوں اور اٹھتے بیٹھتے میرے کانوں کو اذیت پہونچتی رہے وہ اہل زبان کے محاورہ اور زبان کے قاعدے گنوار و خرافات اور زبان کی غلطیوں سے توڑا کرے اور میں مسٹر مسٹر سنا کروں۔ لفظوں کی ٹانگ توڑے اور ان کے بازاری افعال اور ترکیبیں جوڑا کرے اور میں کچھ نہ کہوں۔

بل —— بھائی یقین مانو اس کی باتیں سن سن کر خون کھول نے لگتا ہے۔ اہل زبان کے محاوروں کو آئے دن ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے۔ اس کی معمولی سے معمولی بات میں بھی آپ بلاغت کی دو خطائیں پائیں گے ایک تو بے محل الفاظ دوسرے الفاظ کی سمع خراش ترکیبیں۔

کرمی —— بھلا اس سے کونسا ہرج واقع ہوتا ہے کہ وہ اہل زبان کا محاورہ نہیں جانتی۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ کھانا خوب پکاتی ہے مجھ سے سچ سچ پوچھو تو میں نہیں کہونگا کہ اگر اس کے اسماء افعال سے مطابقت نہیں کھاتے تو نہ کھائیں۔ اور سوقیانہ لفظ دن بھر میں ایک دفعہ نہیں سینکڑوں دفعہ بکتی ہے تو بکا کرے لیکن ترکاری اچھی طرح بنائے اور گوشت کو اتنا نہ بھونے کہ جل جائے اور میرے سالن میں نمک ہلاہل نہ کر دے۔ اچھے سالن پر میری زندگی قایم ہے نفیس نفیس باتوں سے پیٹ نہیں بھرا کرتا۔ بڑے سے بڑا صرفی اور نحوی اچھا سالن پکانا نہیں سکھا سکتا۔ اہل زبان اور زباندان اہل قلم یا شاعر قلم دوات کی حد تک کیسی ہی نفیس باتیں بنائیں مگر باورچی خانہ میں کفگیر اور پتیلی کے آگے غالباً نرے گدھے ہی ثابت ہوں گے۔

فلا ـــــ یہ سوقیانہ تقریر کس قدر کانوں کو شاق گزر رہی ہے تنزل کی حد ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مرد کہتا ہے مادی باتوں کی جانب جھککر پست ہو جائے بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو غیر مادی لطیف چیزوں کی طرف بلند کرے۔ کیا یہ گندا سندا جسم اس قابل ہے اور اس قدر قیمتی ہے کہ اس پر ذرا بھی دھیان کیا جائے ایسی چیزوں کو ہمیں اپنے دل سے دور ہی رکھنا چاہیئے۔

کری ـــــ میرا جسم "میں" ہوں اور میں تو اس کی ضرور دیکھ بھال کرونگا تمہارا جی چاہے اسے گندا کہو۔ مجھے تو یہ گندا ہی بہت پیارا ہے۔

بل ـــــ جسم روح کی تقویت کے بعد تو البتہ کچھ وقعت پیدا کر لیتا ہے سارے عالم اور فاضل جس بات کو مانتے آئے ہیں اگر بھائی آپ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر روح کو یقیناً جسم پر ترجیح ہونی چاہیئے بڑے جتن سے طرح طرح کے دکھ سہہ سہہ کر ہمیں اولاً یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے علم کی لطیف غذا سے روح کی پرورش کریں۔

کری ـــــ تمہیں روح کی پرورش ہی مقصود ہے لیکن جہاں تک مجھے خبر لگی ہے تم لوگ روح کو بہت معمولی غذا دے رہے ہو تمہیں کوئی فکر کوئی خرخشہ . . . .

فلا ـــــ ہے ہے اس لفظ خرخشے سے میرے کان کے پردے پر چوٹ سی لگتی ہے اس میں سے پرانی بول چال کی بو باس آتی ہے۔ اور اب اس ڈھنگ سے لوگ نہیں بولتے وہ زمانہ گیا۔

بل ـ سچ ہے یہ لفظ پرانی وضع کا ہے۔

کری ـــــ کیا اب تم صاف صاف اور سچ سچ سننا چاہتی ہو۔؟

اب مجھ سے رہا نہیں جاتا مجھے دل کی بھڑاس نکالنی ہے لوگ تمہیں احمق کہتے ہیں اور یہ سنکر مجھے بہت ہی قلق ہوتا ہے۔

فلا یک نہ شد دو شد!

کرہی نہیں میرا روئے سخن تم سے ہے ذراسی زبان یا محاورہ کی لغزش تمہیں بے آپے کر دیتی ہے لیکن تم سے کردار میں عجیب عجیب لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔کتابیں تمہارا ہر وقت کا اوڑھنا بچھونا ہیں اور میں ان کی پھوٹی کوڑی کے برابر وقعت نہیں کرتا۔نہیں اس سب انبار کو آگ لگاؤ البتہ بڑی پلوتارک والی جلد رہنے دینا وہ کام کی ہے اس میں گلو بند خوب دبتے ہیں اور شکنیں دور ہو جاتی ہیں۔رہا سائنس اس بیچارے کو کالج کے پروفیسروں کے حوالہ کر دو وہ بڑی سی دوربین جو کوٹھے والے کمرے میں رکھ چھوڑی ہے اسے خدا کے لئے ٹالو۔لوگ اسے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں اور اسی طرح کے بیسیوں گورکھ دھندے رکھنے کو رکھے ہیں جن کو محض دیکھنے سے الجھن ہوتی ہے۔بھلا اس سے کیا حاصل کہ چاند نے لوگ کیا کرتے رہتے ہیں۔اس کے کھوج لگانے کی فکر چھوڑ اور اس کا زیادہ دھیان کرو کہ تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے جہاں سارا کارخانہ اوندھا نظر آتا ہے۔عورت اس میں بھلی نہیں لگتی کہ ہر وقت مطالعہ میں ڈوبی ہے اور ہر بات کی بال کی کھال کھینچتی ہو۔بچوں کو اچھی طرح اٹھانا۔ان کے دماغ کو تربیت دینا گھر کا بندوبست کرنا۔آدمیوں کو کام پر لگانا کفایت شعاری سے خرچ کرنا یہ باتیں ہیں عورت کا فلسفہ اور ان کا ہی مطالعہ اس کو زیب دیتا ہے۔ہمارے بزرگوں نے اس معاملہ میں فہم عامہ سے کام لیا ان کا ٹھیک خیال تھا کہ جب عورت انگرکھے اور ڈھیلے پاجامے

میں تمیز کرنے لگی تو بس اس کی علمیت کی حد ہو گئی ۔ وہ اپنی عورتوں کو زیادہ
نہیں پڑھواتے تھے اور ان کی زندگی نہایت اچھی گزرتی تھی ۔ ان کی
علم و فضل کی باتیں خانہ داری سے متعلق ہوتی تھیں انگشتانے سوئیاں
اور سبچکیں ۔ یہ ان کا کتب خانہ تھا اور بیٹیوں کے بیاہ کے جوڑے ان کی
تصنیف و تالیف ہوتی تھی ۔ آج کل عورتیں کسقدر دور جا پڑی ہیں ۔ قلم
چلا کر مصنف بننا چاہتی ہیں ۔ کوئی علم کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو اس میں ہاتھ
ڈالنا چاہتی ہیں ۔ اس میرے گھر کی حالت تو بد تر کہتر ہے دنیا بھر میں
کہیں ایسا گھر ڈھونڈے نہ ملے بڑی سی بڑی پہیلیاں یہاں بوجھی جاتی
ہیں ۔ دنیا بھر کی اور سب باتیں معلوم ہیں سوائے ان باتوں کے جن کا
جاننا ضروری ہے ۔

تم لوگوں کو چاند قطب تارے ۔ زہرہ ۔ زحل اور مریخ کی حرکتوں کی خبر ہے
اور اس سے میری زندگی کو مطلق سروکار نہیں اور اس خالی خولی دور دراز
کی علمی واقفیت میں کھانے پکانے کے طریقوں اور اصولوں کو دخل نہیں
اور اس بے خبری کا پھل مجھے یہ ملتا ہے کہ بعض اوقات میں بھوکا کا
بھوکا رہ جاتا ہوں نوکروں کا یہ حال ہے کہ تمہیں خوش کرنے کو وہ بھی
علمی ذوق و شوق جتلانے لگے ہیں اور اس بہانے سے اپنے کام کو تن
دہی سے نہیں کرتے ۔ میرے گھر میں استدلال ہر ایک کا مشغلہ ہے حتی کہ
فرط استدلال سے عقل سے چکرا کر اپنا رستہ لیا پکانے والی تاریخ کے مطالعہ
میں ایسی ڈوبتی ہیں کہ کباب جلکر کوئلہ ہو جاتے ہیں ۔ ماماسے پانی مانگو تو
وہ فکر سخن کے ایسے خواب خرگوش میں ہوتی ہے کہ اس کے کان پر جوں
تک نہیں رینگتی ۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ تمہاری وہ بھی ریس کرتے ہیں اور حالانکہ اتنے آدمی ہیں مگر کوئی میری خدمت نہیں بجالاتا لے دیکے ایک یہ لڑکی میرے کام کی رہ گئی تھی اور اس بگڑی آب و ہوا میں بھی اس کا دماغ صحیح سلامت تھا اچھا اس کا یہ حشر ہوا کہ اس کو نکال باہر کر دیا اس لئے کہ وہ اہل زبان کے محاورہ اور روزمرہ کے مطابق بادشاہت نہیں کرتی بہن میں صاف کہدیتا ہوں اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ باتیں ہیں تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہ حرکتیں مجھے تکلیف دیتی ہیں اور طعن بگھارتے لوگ میرے ہاں آتے ہیں اور یہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے خصوصاً سو سو ترسوتین سے مجھے بعض للّہی ہے۔ اس کے اشعار پر تم لوگ وجد کرتے ہو اور اس بات نے شہر بھر میں تمہیں مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ اس کی تقریر مجذوب کی بڑ ہوتی ہے کتنی بھی مغز پاشی کرو۔ خدا نے چاہا تو خاک مطلب سمجھ میں نہ آئے اور میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اس کا ذرا دل چل گیا ہے۔

فلا - یا الٰہی سوفیانہ پن کی کوئی حد بھی ہے اور زبان کس قدر سوقیانہ ہے۔

بل - ایک ننھے سے بھیجے میں کس قدر کوڑ مغزی بھی ہو گئی ہے۔ یا اس سے زیادہ معمولی ہٹی کا دل و دماغ ہو سکتا ہے! اور پھر یہ خیال غضب ہے کہ میری رگوں میں بھی یہی خون ہے! تمہارے خاندان سے ہوں اِسلئے میں اپنے آپ سے سخت نفرت کرتی ہوں اور غیرت کے مارے میں اِس گھر سے ہی اپنا کالا منہ کرتی ہوں۔

سین آٹھواں

فلا - ایک آدھ تیر باقی ہو تو وہ بھی خالی کر دو۔

کری - تیز۔ نہیں۔ بس لڑائی ہو چکی اب اور کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ تمہاری بڑی لڑکی تو شادی کے جھمیلوں سے کچھ بیزار سی ہے۔ یعنے فلا سفر ہے مجھے اِس میں کوئی اعتراض نہیں اس کی تربیت معقول طور پر اور اچھے ہاتھوں میں ہو رہی ہے اور تم نے واقعی خوب اُٹھایا ہے۔ لیکن اس کی چھوٹی بہن اور مزاج کی ہے اور میری رائے میں وقت آگیا ہے کہ آنریت کے لئے کوئی دُولہا انتخاب کیا جائے۔

فلا - مجھے بھی یہی سوجھ تھی میں تم سے بھی کہے دیتی ہوں کہ میرے دل میں کیا بات تھی۔ موسو ترسوتین جو اتنا لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے اور جسے تم بھی اچھا نہیں سمجھتے اس لئے بے موزوں ہے اور موسو ترسوتین کی خوبیاں تم سے بہتر میں جانتی ہوں۔ اس بارے میں حیث بحث بے سود ہے میں ہر پہلو پر غور کر کے اپنے دل میں یہ بات ٹھان چکی ہوں دیکھو یاد رکھنا کہ ابھی یہ بات زبان سے نہ نکلے تمہاری لڑکی سے میں چاہتی ہوں کہ پہلے میں خود ذکر کروں تم بعد کو اگر چاہو تذکرہ کرنا بعض مصلحتیں ایسی ہیں کہ یہ وتیرہ بھی مناسب ہوگا۔ اگر تم نے اشارے یا کنایہ سے اِس بات کو آنریت تک پہونچایا تو مجھ سے یہ بات چھپی تو رہنے کی نہیں۔

سین نواں

اریست ——— کریسال

اریس - کہئے بھائی کیا ہوا؟ بھابی ابھی باہر گئی ہیں۔ تمہاری صورت سے

معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بات چیت ضرور ہوئی ہے۔
کری۔ ہاں۔
اریس۔ اچھا تو پھر اس کا نتیجہ تو سنیں؟ کیا آنزیت کا بیاہ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا؟ بھابی راضی ہو گئیں؟ معاملہ طے پا گیا؟
کری۔ نہیں ابھی کچھ طے تو نہیں ہوا
اریس۔ کیا انھوں نے انکار کر دیا۔؟
کری۔ نہیں۔
اریس۔ کیا کچھ تامل ہے۔
کری۔ مطلق نہیں۔
اریس۔ تو آخر پھر بات کیا ہے؟
کری۔ تمہاری بھاوج نے ایک اور شخص پیش کیا ہے۔
اریس۔ کوئی اور داماد پیش کیا ہے؟
کری۔ ہاں ایک اور آدمی۔
اریس۔ اس کا نام تو سنوں۔
کری۔ موسوترسوتین۔
اریس۔ ہائیں وہی موسوترسوتین۔
کری۔ ہاں ہاں وہی جو ہمیشہ شاعری اور لاطینی بگھارا کرتا ہے۔
اریس۔ کیا تم بھی رضامند ہو گئے؟
کری۔ خدا بچائے میں اور راضی ہو جاتا؟
اریس۔ تم نے کیا جواب دیا؟
کری۔ کچھ نہیں اور خوش ہوں کہ میں نے کچھ کہا نہیں۔ نہ معلوم میرے

منھ سے کچھ نکل جاتا اور میری بات پکڑلی جاتی۔

اریس۔ چپ رہنے کی وجہ تو نہایت معقول ہے۔ خیر یہ پہلا قدم برا نہیں رہا یہ بھی ایک طرح کی کامیابی ہے۔ تم نے کلتاندر کے پیام کا ذکر تو کرہی دیا ہوگا؟

کری۔ نہیں کہاں سے ذکر کرتا؟ جب میں نے دیکھا کہ وہ اور ہی داماد کی دھن میں ہیں تو میں نے ذکر کرنا مناسب نہ جانا۔

اریس۔ آپ کی یہ حزم واحتیاط یقیناً غیر معمولی ہے؟ تمہیں اپنی کمزوری پر شرم نہیں آتی؟ لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک مرد اور اتنا کمزور ہو کہ بیوی مطلق العنان ہو جائے اور اس کی مرضی کے خلاف کسی بات کے کہنے یا کرنے کی جرات نہ ہو؟

کری۔ للہ بھائی یہ نہ کہو تمہارا کیا ہے۔ کہدینا بہت آسان ہے۔ تم کو خبر نہیں کہ ذرا سی گڑبڑ ہوئی اور بس میرے ہوش وحواس ٹھکانے نہیں رہتے۔ میں تو امن چین کا دلدادہ ہوں اور چپ چاپ زندگی پسند کرتا ہوں میری بیوی کا غصہ آلہی تو بہ وہ فلاسفرانہ صفات کا بڑی شدومد سے ذکر کرتی ہے لیکن یہ نری باتیں ہی ہوا کرتی ہیں غصہ اس کا جوں کا توں ہے۔ اخلاق کی باتیں کرنے پر آئے تو روپیہ پیسہ جیسی چیز اس کی آنکھوں میں نہیں جچتی مگر ان اخلاقیاتی مسائل کا شمہ برابر بھی اس کی تیز مزاجی پر اثر نہیں جس بات کے کرنے کی دل میں بس گئی اس کی ذرا بھی کسی نے مخالفت کی اور بس ایک ایک ہفتہ گھر ہے کہ قیامت کا نمونہ جب وہ اپنا خاص غصہ کا لہجہ اختیار کرتی ہے تو میں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ بس یہ جی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں جب اس پہ غصہ کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہتی۔ اژدہے کے سے

پھٹکارے مارتی ہے اس کا ڈائین کے سے مزاج کے باوجود مجھے گزارہ کرنا ہے یہی کہنا پڑتا ہے۔میری۔دلبر میری پیاری۔

اریس۔بھلا یہ بھی کوئی بات ہے آپ مذاق کر رہے ہیں یہ بات بس اپنے تک ہی رکھیگا کہ تمہاری بیوی اس لئے تم پر حکومت چلاتی ہیں کہ تم بزدل ہو ان کے زور کی بنیاد تمہاری کمزوری ہے سارے فساد کی جڑ تم خود ہو تمہیں نے یہ ہلکپٹ ڈالی ہے کہ وہ تمہاری سرکار بن گئی ہیں تم ان کی چیرہ دستی کے آگے جھک جاتے ہو اور اپنے آپ کو موم کی ناک بنا لیا ہے مرد خدا تم مرد کہلاتے ہو تو ایک دفعہ تو مرد بن کر دکھا دو۔ایک عورت ذات کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے اور یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے کہ "میں بس یوں چاہتا ہوں اور یوں ہی ہوگا" تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہاری بیٹی کو ان مجنونانہ خیالات کے بھینٹ چڑھایا جائے جو تمہارے گھر پر چھا گئے ہیں اور ایک احمق گدھے کو ساری دولت دیدیجائے محض اس لئے کہ وہ لاطینی میں کچھ شد و بد رکھتا ہے کچھ گنتی کے لفظ یاد کر لئے ہیں اور ان کو ہر جگہ لکھتا پھرتا ہے اور محض جھوٹ موٹ کا عالم ہے اور تمہاری بیوی ہیں کہ اسے بذلہ سنج اور حاضر جواب کی طرح خطاب کرتی ہیں اسی کے کلام کو پاکیزہ سمجھتیں اور اس کو بے نظیر شاعر قرار دیتی ہیں حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اس کو اور نفیس سخن سنجی کو کیا نسبت؟ بس بھائی مذاق کی بھی حد ہوئی ہے تمہارا چلن مضحکہ کے قابل ہے۔

کریسی۔ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔بیشک میں ہی غلطی پر ہوں۔اچھا اب میں بھی دکھا دونگا کہ میرا کتنا دل مضبوط ہے۔

اریس۔یہ بات کہی ہے شاباش۔

کریسی۔یہ واقعی ایک وبال جان ہے کہ عورت کو اس طرح سر پر چڑھا لیا جائے۔

اریس۔ سچ کہا۔
کری۔ اس نے میری نرم مزاجی سے خوب فائدہ اٹھایا۔
اریس۔ بالکل ٹھیک سمجھے۔
کری۔ میری نیک طینتی پر چھا گئی۔
اریس۔ بے شک۔
کری۔ آج ہی میں اس کو د کہا دونگا کہ میری بیٹی میری ہی بیٹی ہے اور مجھے اختیار ہے کہ جس کے ساتھ چاہوں اس کی شادی کر دوں۔
اریس۔ یہ کہی سمجھ کی بات اور یہ سنکر میرا جی خوش ہوگیا۔
کری۔ تم تو کلتا ندر کے طرفدار ہو ہی اس کا گھر تمہیں معلوم ہوگا۔ ہاں تو اس سے کہدینا کہ مجھ سے فوراً آنکر ملے۔
اریس۔ میں ابھی اسے بھیجے دیتا ہوں۔
کری۔ بہت دنوں تک میں نے یہ باتیں برداشت کیں اب میں مرد بنونگا۔ چاہے ساری دنیا مجھ سے پھر جائے۔

ایکٹ تیسرا

سین پہلا

فلامنت ۔ ارماند ۔ بلیس ۔ ترسوتین ۔ لے پین
فلا۔ آئیے یہاں بیٹھ جائیں اور آرام سے یہ اشعار سنیں۔ ان کے ایک ایک

لفظ کو تولنا پڑے گا۔

ار۔ میرے دل میں توشوق نے آگ سی لگا دی ہے۔

بل۔ اور ہم سبھوں کی بیتابی کے مارے جان ہیکل ہے۔

فلا۔ تمہارے قلم سے جو چیز نکلتی ہے میرے لئے دلکش ہوتی ہے۔

ار۔ اور اس کے آگے مسرتیں ہیچ ہوتی ہیں۔

بل۔ میرے کانوں کو ایک تحفہ ضیافت ہوتی ہے۔

فلا۔ ہمارا شوق ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اب زیادہ راہ نہ دکھائے۔

ار۔ عجلت کیجئے۔

بل۔ دیر نہ فرمائیے۔ مسرت کا جلدی موقع دیجئے۔

فلا۔ ہمارے ان شوق کے شعلوں پر اپنے کلام کا پانی ڈالئے۔

تر۔ افسوس ہیم صاحب ابھی قطعہ بیچارہ نوزائیدہ بچہ ہے اس کی خوش نصیبی سے آپ کے دل میں ضرور اس کی جگہ ہونی چاہیئے۔ کہ آپ کے صحن میں ہی اس نے جنم لیا ہے۔

فلا۔ . . . . . آپ اس کے باپ ہیں یہ بات اس کے پیارے بنانے کو کافی ہے۔

تر۔ آپ کی قدردانی اس کو مادر مشفق کا کام دیگی۔

بل۔ ہائے یہ حاضر جوابی!

سین دوسرا

انریت۔ فلامنت۔ ارماند۔ بلیس۔ ترسوتین۔ لے پین

فلا۔ ہائیں یہ کیا! تم کیوں بھاگی جاتی ہو۔
آن۔ اِس خوف سے کہیں آپ کی لذیذ صحبت میں خلل نہ پڑے۔
فلا۔ آؤ۔ یہاں میرے پاس بیٹھو پوری طرح کان کھولکر سحر کلامی کا لطف اٹھاؤ۔
آن۔ میں شعر شاعری کی خوبیاں بھی نہیں جانتی۔ ذہنی مشاغل سے میں کوسوں دور رہوں۔
فلا۔ تو کیا ہرج ہے۔ بجھے تم سے ابھی ایک ضروری راز کی بات بھی کہنی ہے۔
تتر۔ علوم میں کوئی بات نہیں کہ تمہارا دل لگے تمہیں تو یہ جاننے کی دھن ہے کہ کس طرح دلوں کو لبھایا جائے۔
آن۔ نہ مجھے اس کی فکر ہے نہ میری خواہش ہی ہے۔
بل۔ اے ہے۔ اسوقت تو نوزائیدہ بچے کا خیال چاہیئے۔
فلا۔ چھوکرے جلدی سے کرسیاں لا۔ (چھوکرا کرسی سمیت گر پڑتا ہے) یہ لونڈا کیا بے ڈھنگا۔ جب ایک دفعہ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مرکز ثقل کے لحاظ سے اپنا جھوک کیونکر سنبھالنا چاہیئے تو پھر گر پڑنا کیا معنے!
بل۔ ارے بیوقوف۔ اپنے گرنے کی وجہ بھی تجھے سوجھی تو اس لئے زمین پہ آرہا ہے کہ تو اس اٹل نقطے سے جسے ہم مرکز ثقل کہتے ہیں ہٹ گیا تھا۔
لے پین۔ ہاں بیم صاحب جب زمین پر آرہا تو مجھے سمجھائی دیا۔
فلا۔ بے ڈھنگا کہیں کا۔
تتر۔ کیا ہی اچھا ہوا کہ یہ شیشہ کا نہ تھا۔

ار ۔ ہائے ۔ وہی حاضر جوابی ۔

بل ۔ کبھی چوکتی ہی نہیں خزانہ میں کمی ہی نہیں ۔

فلا ۔ اب اپنی ضیافت کا دستر خوان چنئے ۔

تمر ۔ بھلا ایک رکابی صرف آٹھ مصرع والی ہے ۔ ایسی کہاں کہ آپ لوگوں کی اس زبردست اشتہا کی آگ بجھا سکے ۔ میں سوچتا ہوں کہ اس قطعہ کے ساتھ ایک نظم (ہفت بیتی) کی چاٹ بھی مل جائے تو کچھ تو آپ لوگوں کا حلق بھیگیگا ہاں اس نظم کو ایک شہزادی نے ۔ میں نام نہ لوں گا ۔ نفیس فرمایا اس میں شروع سے آخر تک آپ ظرافت کا نمک مرچ پائینگی ۔ اور اس کو اچھی خاصی نظم تصور فرمائیں گی ۔

ار ۔ مجھے اس میں شک نہیں ۔

فلا ۔ بس اب سناڈالئے ۔

بل ۔ (وہ پڑھنا چاہتا ہے یہ بیچ میں ٹپک پڑتی ہے ۔) میرا دل سننے سے پہلے ہی خوشی کے مارے تھر تھرا رہا ہے مجھے شاعری سے عشق ہے خصوصاً ایسے کلام پر دم دیتی ہوں جس میں عاشقانہ رنگ اور معاملہ بندی ہو ۔

فلا ۔ اگر تم یونہی بولتی رہیں تو پھر یہ اشعار پڑھ چکے ۔

تمر ۔ نظم . . . .

بل ۔ اے ہے ۔ میری پیاری بھتیجی ۔ خاموش ۔

تمر ۔ نظم شہزادی یورانی کے بخار پر ۔

مگن نیند میں تھی تمہاری وہ بیدار مغزی

لیا جو سر آنکھوں پہ اس کو بصد شان و شوکت

رکھا جہاں اپنے تن میں بصد عیش و عشرت

جو دشمن تمہارا ستم یہ کہ دشمن بھی جانی

بل۔ ہائے! کیا ہی نفیس آغاز ہے۔

ار۔ کیا ہی حسین طرز ہے۔

فلا۔ ایک انہیں کے اشعار میں سہل ممتنع کا کمال پاتی ہوں۔ اور بھر آمد تو دیکھو۔

ار۔ مگن نیند میں تھی وہ بیدار مغزی، داد کے قابل ہے۔

بل۔ رکھا مہمان اپنے تن میں، کیا کہوں مجھے کیا لطف دے رہا ہے۔

فلا۔ بصد شان و شوکت۔ بصد عیش و عشرت، میں تو ان الفاظ پر لوٹ ہوں یہ آپس میں کس خوبی سے گھل مل سے گئے ہیں۔

بل۔ آگے تو سنئے۔ کان مشتاق ہیں۔

تتر۔ مگن نیند میں تھی تمہاری وہ بیدار مغزی
لیا جو سر آنکھوں پہ اسکو بصد شان و شوکت
رکھا مہمان اپنے تن میں بصد عیش و عشرت
جو دشمن تمہارا ستم یہ کہ دشمن بھی جانی

ار۔ مگن نیند میں تھی وہ بیدار مغزی۔

بل۔ رکھا مہمان اپنے تن میں،

فلا۔ بصد شان و شوکت۔ بصد عیش عشرت۔

تتر۔ کوئی کچھ کہے میں کہونگا نکالو اس افعی
کو انمول پاکیزہ نازک بدن سے بعجلت
ہے محسن کشی بے وفائی سدا اُسکی خصلت
نہ پڑ جائیں لالے کہیں جان کے ہی تمہاری

بل۔ خدا کے لئے ٹھیر کر مجھے ذرا سانس لے لینے دیجئے۔
ار۔ براہ کرم لطف اٹھانے کی مہلت تو دیجئے۔
فلا۔ ان اشعار کو سنکر ایسا معلوم دیتا ہے کہ روح کی شریک ہیں۔ ایک تھرتھراتا احساس ہے کہ دوڑ گیا ہے۔
پس وہی کیفیت سمجھو جو غشی سے کچھ پہلے چھا جاتی ہے۔
ار۔ کوئی کچھ کہے میں کہونگا نکالو اس افعی کو انمول
پاکیزہ و نازک بدن سے بعجلت
انمول پاکیزہ نازک بدن۔ کس حسن سے ادا کیا گیا ہے ایک ایک لفظ سے طباعی اور قادرالکلامی ٹپکی پڑتی ہے۔
فلا۔ کوئی کچھ کہے میں کہوں گا۔ کس قدر قابل تعریف ذوق کا پتہ دیتا ہے میری رائے میں یہ فقرہ انمول ہے۔
ار۔ میں بھی اسی 'کوئی کچھ کہے' پر غش ہوں۔
بل۔ مجھے بھی آپ سے اتفاق ہے۔ کوئی کچھ کہے کیا جچا تلا بیٹھا ہے۔
ار۔ کاشں یہ فقرہ میرے قلم سے نکلتا۔
بل۔ یہ فقرہ ایک پوری نظم ہے۔
فلا۔ مگر کیا تم لوگوں کو اس کے نفیس مطالب کی وہ پرچھائیاں بھی سمجھا دے رہی ہیں جو میرے پیش نظر ہیں اور جن کی میں داد دے رہی ہوں؟
بل۔ ار۔ ہائے کیا چیز کہی ہے۔
فلا۔ کوئی کچھ کہے میں کہوں گا۔ . . . .
کہتے ہیں اگر لوگ بخار کے جانب دار بھی ہو جائیں تو ان کی بیہودہ بکواس

پہ نہ جانا۔

کوئی کچھ کہے میں کہوں گا۔

ہائے۔ کوئی کچھ کہے۔ ہاں کوئی کچھ کہے۔

اس 'کوئی کچھ کہے' میں بہت سے معنے ہیں جو پہلی نظر میں سمجھ میں نہیں آتے کسی کو مجھ سے اتفاق ہو یا نہ ہو مجھے تو ان الفاظ میں لاکھوں ہی معنے دکھاتی دیتے ہیں۔

بل۔ اس میں شک نہیں یہ جامع الفاظ بہت معنے رکھتے ہیں جو بادی النظر میں ظاہر نہیں ہوتے۔

فلا۔ مگر تم نے موسوجب یہ الفاظ لکھے 'کوئی کچھ کہے' تو کیا تم نے بھی اس کے پورے زور اور وسعت کو محسوس کیا تھا۔ تمہارے ذہن میں وہ تمام باتیں مستحضر تھیں جو ہمارے دماغ میں اس فقرے سے پیدا ہوتی ہیں اور کیا یہ تمہارا ارادی فعل تھا کہ اس فقرہ میں معنے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے جائیں؟

تمر۔ ہاں۔ ہاں۔

ار۔ میرے دل میں تو یہ الفاظ محسن کشی بے وفائی سدا اس کی خصلت چھا گئے ہیں۔ احسان فراموش قابل نفرت بخار ان کے ساتھ ہی برا سلوک کرتا ہے جو اوسے پناہ دیتے ہیں۔

فلا۔ مختصر یہ چار چار مصرعوں والے ٹکڑے دونوں کے دونوں خوب ہیں۔ خدا کے لئے دونوں مثلث جلد سے سنائیے۔

ار۔ براہ کرم 'کوئی کچھ کہے' کو ذرا دوبارہ ارشاد فرمائیے۔

تمر۔ کوئی کچھ کہے میں کہوں گا نکالو اس افعی۔

فلا۔ ار۔ بل۔ ہائے کوئی کچھ کہے۔

تمر۔ کو انمول پاکیزہ نازک بدن سے بعجلت۔
فلا۔ ار۔ جل۔ انمول پاکیزہ نازک بدن۔۔۔۔۔۔
تمر۔ ہے محسن کشی بے وفائی سدا اس کی خصلت۔
فلا۔ ار۔ اور جل۔ بچار کی محسن کشی۔ خوب۔
تمر۔ نہ پڑ جائیں لالے کہیں جان کے بھی تمہاری۔
فلا۔ نہ پڑ جائیں لالے، واہ
ار۔ اور جل۔ سبحان اللہ۔
تمر۔ تمہارے نہ رتبہ کا اس کو ذرا دھیان آیا
پیا خون اس نے تمہارے لہو کا تھا پیاسا
فلا اور جل۔ واہ قلم توڑ دئے۔
تمر۔ یہ ڈر ہے کہیں جان پر داؤ چل جائے اس کا
نہانے کو حمام میں اب کے تم پیر رکھو
کہاں کی مروت جھپٹ اس کی گردن پکڑ لو
اور اپنے ہی ہاتھوں اسے حوض میں یوں ڈبو دو
فلا۔ ہائے غضب کر دیا۔ تڑپا دیا۔
جل۔ ہم پر غشی سی طاری ہو گئی ہے۔
ار۔ جان ہے کہ وجد کر رہی ہے اعجاز ہے اعجاز۔
فلا۔ میرے تو سر سے لیکر پیر تک طرح طرح کی سنسنیاں سی دوڑ رہی ہیں
ار۔ نہانے کو حمام میں اب کے تم پیر رکھو۔
جل۔ کہاں کی مروت ہے جھپٹ اس کی گردن پکڑ لو۔
فلا۔ اور اپنے ہی ہاتھوں اسے حوض میں یوں ڈبو دو اپنے ہی ہاتھوں

ستے۔ واہ۔ واہ۔

ار۔ تمہارے کلام کا ہر مصرع بڑا چڑا ہوتا ہے اور اس میں نئی نئی دلفریبیاں ہوتی ہیں۔

بل۔ ہر لفظ کہیں سے لے لو وجد میں لانے کو کافی ہے۔

فلا۔ ہر لفظ ہر بات سے لطافت ہے کہ ٹپکی پڑتی ہے۔

ار۔ جو اشارہ جو کنایہ ہے پھولوں کی طرح خوش رنگ۔

تتر۔ تو آپ کے خیال میں یہ سانٹ (ہفت بیتی)

فلا۔ لاجواب۔ جدت بھری۔ نئی چیز ہے کسی کا کلام اس قدر نفیس ابتک میری نظر سے نہیں گزرا۔

بل۔ ہائیں۔ آنریت! تمہارے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تمہاری چپ پیاری بھتیجی کس قدر بدنما ہے۔

آن۔ اس دنیا میں ہر ایک کی طبیعت اور اس کا کام جدا جدا ہے جس میں طباعی اور ذوق شاعری نہ ہو وہ کہاں سے پیدا کرلے۔

تتر۔ شاید میرے کلام سے تم اکتا جاتی ہو۔

آن۔ ہرگز نہیں۔ میں سنتی ہی نہیں۔

فلا۔ اے ہے۔ اب اپنا قطعہ سنایئے۔

تتر۔ ایک گاڑی پر جس کا رنگ سدابہار(۱) کا تھا اور جو مصنف کی ایک شناسا خاتون کو دی گئی تھی۔

فلا۔ ان کے عنوان تو ملاحظہ ہوں۔ یہ بھی جدت سے خالی نہیں۔

ار۔ ان کا انوکھا پن پہلے ہی سے پتہ دیتا ہے کہ نظم میں کیا کیا طباعی بجلیاں بھری ہوں گی۔

(1) AMORANTE

تمر۔ نہ عشق کو فقط تھی دل سے لاگ۔
بل۔ ارے۔ اور فلا۔ واہ۔ واہ۔
تمر
لگائی جائداد کو بھی آگ
وہ خوشنما فشن وہ نیم نام
نفیس قیمتی طلائی کام
وہ میری نور بائی صبح و شام
نکلتی ہے۔ ہے دور دور نام
فلا۔ کیا خوب! نور بائی۔ معلومات کی وسعت تو دیکھئے۔
بل۔ کیا نفیس کنایہ ہے۔ جواب نہیں رکھتا۔
تمر
کہو نہ رنگ کو سدا بہار
روپیہ کے خون کی ہے سب بہار
ارے۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ کس قدر رنگین خیال ہیں کس کو توقع تھی کہ یہ بات نکالی ہوگی۔
فلا۔ سوائے ان کے اور کس کے کلام میں یہ نفاست اور ذوق صحیح ہو سکتا ہے۔
بل۔
کہو نہ رنگ کو سدا بہار
روپیہ کے خون کی ہے سب بہار۔
بہار ذو معنی ہے۔ بھئی واہ کیا بات پیدا کی ہے سدا بہار کا شوخ سرخ رنگ ہوتا ہے اور روپیہ کے خون کی ہے سب بہار۔ کیا کہنے۔
فلا۔ کچھ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے جان پہچان سے پہلے ہی میرا دل تمہاری سحر بیانی کا قائل تھا۔ تمہاری طرفداری تھی۔ میں تمہاری نظم اور نثر

دونوں کی دلدادہ ہوں۔

تمر۔ اگر آپ اپنی بھی کوئی چیز ہم کو سنائیں تو یقین مانئے ہمیں بھی داد دینے کا موقع ملیگا۔

فلا۔ میں نے شاعری میں تو قدم نہیں رکھا ہے۔ البتہ مجھے ایسا ہے کہ عنقریب آپ کو محرم راز بنا کر اپنی اکاڈمی والی اسکیم کے آٹھ باب سناؤں گی۔ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں اس مضمون کے لفظ حاشیہ کو چھوا اور چھوڑ دیا۔ لیکن میں اس خیال کو پوری طرح پھیلا رہی ہوں میں نے کاغذ پر اور نثر میں اس کا پورا خاکہ تو بنا ہی لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے لوگوں کی اس بے انصافی پر جو ہمارے عقل اور ذہانت کے ساتھ برتی جاتی ہے بہت ہی غصہ آتا ہے میں اپنی صنف پر سے یہ بہتان اٹھا کر ہی چھوڑوں گی۔ اس کا یہ پھل ملیگا کہ عورت ذات کو مردوں نے اب جس حیثیت میں ڈال رکھا ہے وہ اس سے کہیں بلند اور مرفع ہو جائے گی۔ ہماری قابلیت صرف اسی حد تک محدود کر دی گئی ہے کہ جب چاہے گھریلو زندگی بسر کریں اور علمی بلندیوں اور جولانیوں کے راستے ہمارے لئے بند کر دیئے گئے ہیں۔

ار۔ ہماری صنف لطیف کی یہ ذہانت ہے کہ ہماری ذہانت اسی قابل سمجھی جائے کہ انگیہ کی وضع قطع کو جانچ پائیچوں کی تراش خراش سمجھ سکیں اور لیس اور بیلوں پر رائے زنی کی جائے۔

بل۔ ہم کو چاہیئے کہ اس شرمناک پستی سے اپنے آپ کو اونچا کریں اور مرد کے کھوسٹے کے بل جو بیاں کدوائی ہیں ان کو کاٹ کر آزاد ہو جائیں۔

تمر۔ میں جس حد تک خواتین کا احترام کرتا ہوں وہ دنیا کو معلوم ہے میں اگر ان کی آنکھوں کی چمک دمک کا پرستار ہوں تو ساتھ ہی ان کی ذہنی دنیا کی بھی

عزت کرتا ہوں۔

فلا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری صنف بھی ذہنی امور میں تمہارے ساتھ منصفی کرتی ہے۔ لیکن ہم بعض تنگ نظر لوگوں پر جو ہم کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم عورت ذات ہیں تو ہوا کریں علوم سے ہمارے دماغ بھی سجے سجائے ہیں ہم بھی مردوں کی طرح علمی مجالس کر سکتے ہیں اور زیادہ بہتر طریقے سے ہم چاہتے ہیں کہ جو چیزیں اور جگہ علیحدہ کر دی گئی ہیں ان کو ملا دیں ایک ہی انجمن میں ادبی حسن بیانی اور اعلیٰ علوم کی مہارت کو اکٹھا کر دیں ہر قسم کے اختلاف رائے کو مسائل زیر بحث کے متعلق اس انجمن میں راہ دیں اور کسی ایک رائے کے طرفدار نہ بنیں۔

تر۔ نظام حکمت کے بارے میں مجھے ارسطو پر اعتقاد ہے۔

فلا۔ جہاں تک مجرد خیالات کا تعلق ہے میں افلاطون پر دم دیتی ہوں۔

ار۔ اپی کیورس میں مجھے حلاوت آتی ہے اس کا استدلال بہت قوی ہوتا ہے۔

بل۔ میں ذرات کے نظریہ سے اپنے دل کو تسکین دیتی ہوں لیکن مجھے خلا کا احساس بمشکل نظر آتا ہے اسی سے مجھے مادہ لطیف کا نظریہ زیادہ بھاتا ہے

تر۔ مقناطیس کی بحث میں میرا خیال ہے کہ دیکے کارتے بہت کچھ حق بجانب ہے۔

ار۔ میں تو اس کے ذراتی چکر ان پر جان دیتی ہوں۔

فلا۔ اور میں اس کے گرتے ستاروں پر جان چھڑکتی ہوں۔

ار۔ میری آرزو ہے کہ جلدی سے ہماری مجلس کی افتتاح ہو اور ہماری شہرت کی بنیاد کوئی نیا انکشاف ہو۔

تھر۔ آپ کے ذہن رسا سے بڑی توقعات ہیں میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فطرت کا کوئی راز آپ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

فلا۔ خودستائی میں نہیں کرتی لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ مجھے ایک انکشاف ہاتھ لگ چکا ہے۔ مجھے صاف صاف چاند میں آدمی دکھائی دیئے ہیں۔

بل۔ میں یہ تو کہہ نہیں سکتی کہ میں نے آدمی دیکھے ہیں البتہ مجھے چاند میں مینار اور برجیاں ضرور دکھائی دی ہیں۔

ار۔ طبیعیات، گرامر، تاریخ، شاعری، اخلاقیات اور سیاسیات ان علوم کی گہرائیاں تک ہم کھنگول ڈالیں گے۔

فلا۔ فلسفہ اخلاق مجھے بہت مرغوب ہے اس لئے کہ بڑے بڑے حکیموں نے قدیم زمانہ میں اس کو اپنا محبوب مطالعہ قرار دیا اس میدان میں میں اسٹوائک فرقہ کی ہمزبان ہوں کہ عقل برترین شئے ہے اور نیکی اخلاقیات کی کسوٹی ہے۔ انھوں نے جو دانشمند انسان کا خیالی نمونہ پیش کیا ہے اس سے نفیس تر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

ار۔ کچھ زیادہ دن نہیں لگیں گے کہ زبان کے متعلق ہمارے قواعد وضوابط دنیا کے سامنے پیش ہوں گے۔ اس بارے میں ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم نے کچھ تبدیلیاں کی ہیں کچھ قدرتی طور پر اور کچھ غور و خوص کر کے ہم میں سے ہر ایک نے چند الفاظ کو قابل نفرت راندۂ درگاہ قرار دیا ہے ان الفاظ میں اسما بھی اور افعال بھی شامل ہیں اور ہم نے یہ آپس میں طے کر لیا ہے کہ ان مردود لفظوں کو ترک کر دیں ہم ان کی موت کے فتوے تیار کر رہے ہیں۔ اور ہماری علمی مجالس کی افتتاح یوں ہی ہوگی کہ ان مختلف الفاظ کی نثر اور نظم میں ممانعت کی منادی کر دی جائے گی۔

فلا۔ لیکن اس ہماری اکادمی کی نفیس ترین تجویز یہ ہے کہ زبان کو ایسے گندے اجزا سے پاک کیا جائے جو حسین سے حسین الفاظ سے طرح طرح مل کر خیال کو فحش اور سوقیانہ پن کی طرف لیجاتے ہیں اور کوڑ مغز گدہوں کے دماغ کے کھلونے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں رکیک اور بے شرمی کے کنایات کا گودام بن جاتے ہیں اور جن سے ایسے نابکار مستورات کی حیا اور غیرت کا خون کرتے ہیں یہ تجاویز ایک عظیم الشان ذمہ داری ایک شہرت دوام کی تدابیر ہیں جس پر میں تو دل وجان سے لوٹ ہوں۔

تمر۔ یقیناً یہ تجاویز قابل قدر ہیں۔

ل۔ ہمارے لسانی قوانین آپ ملاحظہ فرمائیے گا۔ ذرا وہ قطعی طور پر ضبطِ قلم ہو لیں۔

تمر۔ مجھے یقین ہے کہ ہر قانون مکمل اور عقل و دانش سے لبریز ہوگا۔

ار۔ یہ ہمارے وضع کئے ہوئے قوانین ہم کو ہر تصنیف کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے۔ خواہ تصنیف نظم میں ہو یا نثر میں اس کو ان قوانین کی کسوٹی پر کسا جائے گا۔ سوائے ہمارے اور ہمارے خاص خاص دوست احباب کے اور کسی کو یہ حق نہ رہے گا کہ دماغ واری اور طباعی کا دم مار سکے۔ ہم ایک ایک کی نکتہ چینی کریں گے اور چن چن کر عیب نکالیں گے یہاں تک کہ بس ہمارے سوا اور سب تصنیف سے ہاتھ اٹھالیں۔

سین تیسرا

سے لے ہین۔ ترسوتین۔ فلامنت۔ بلیس۔ ارماند۔ آنریت۔ وادیوس

لے۔ موسیو کوئی آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے اس کے کپڑے کالے ہیں
اور بہت دھیمی آواز میں بولتا ہے۔

تھر۔ اہو۔ یہ وہی میرے عالم فاضل دوست ہیں جن کو آپ سے شناسائی کا
بیحد شوق ہے اور بڑے اصرار سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ تعارف کردو۔

فلا۔ آپ شوق سے تعارف کرایئے آپ کو پوری اجازت ہے دیکھو ہوشیار
ہم کو اپنی ذہانت اور طباعی کا بڑی خوبی سے اظہار کرنا ہوگا۔ ہاں آنریت کہاں چلیں
میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے تم سے کچھ کہنا۔

آن۔ آخر کیا کہنا ہے؟

فلا۔ آؤ یہاں بیٹھو میں ابھی تم سے کہہ دوں گی۔

تھر۔ یہی وہ صاحب ہیں جو آپ سے ملنے کے بیحد مشتاق ہیں اور ان کو آپ سے
ملانے میں مجھے کوئی تامل نہیں اس لئے کہ یہ ایک فاضل اور قابل آدمی ہیں اور
معمولی لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ اور بڑے سے بڑے قابل اور بذلہ سنج لوگوں
کے مجمع میں کسی سے ہیٹے نہیں۔

فلا۔ جن صاحب نے ان کا تعارف کرایا ہے وہ ان کے علم و فضل اور کمالات
کی کافی ضمانت ہیں۔

تھر۔ یہ قدیم مصنفوں سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں اور یہ یونانی خوب
جانتے ہیں فرانس میں ان سے زیادہ اس زبان کا جاننے والا شاید ہی کوئی نکلے۔

فلا۔ یونانی۔ ماشاءاللہ۔ یونانی۔ نہیں یہ صاحب یونانی زبان جانتے ہیں۔

بل۔ میری پیاری بھتیجی سنتی ہو۔ یونانی۔

ار۔ یونانی۔ کیسی خوشی کی بات ہے۔

فلا۔ ہاں تو موسیو آپ واقعی یونانی جانتے ہیں؟ یونانیوں کی خاطر اجازت

دیجئے کہ میں آپ کو گلے لگاؤں۔

(وہ سبھوں سے گلے ملتا ہے سوائے آنزیت کے)

آن۔ موسیو مجھے معاف رکھئے۔ میں یونانی نہیں سمجھ سکتی۔

فلا۔ میں یونانی کتابوں کا بڑا احترام کرتی ہوں۔

وا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آج ہی نیاز حاصل کرنے کے شوق نے اس قدر مجبور کیا کہ کہیں میں بارِ خاطر یا مخل نہ سمجھا جاؤں اور کسی عالمانہ بحث میں خلل انداز ہو جاؤں۔

فلا۔ موسیو یونانی سے واقف ہونے کے بعد آپ کبھی ہارج ہو ہی نہیں سکتے۔

تر۔ صرف یونانی کا جاننا ہی نہیں۔ یہ شاعر ہیں۔ اور ان کے کلام میں جدت اور اعجاز ہوتا ہے اور اگر وہ رضامند ہو جائیں تو آپ لوگوں کو محظوظ بھی کر دیں۔

وا۔ مصنف ہو یا شاعر یہ کمزوری ان میں پائی جاتی ہے کہ ہر محفل میں وہ اپنی ہی تصنیفات اور کلام کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ دربار ہو یا عالموں کا مجمع۔ گھریلو صحبتیں ہوں یا دسترخوان یہ کمبخت، اپنے سمع خراش اشعار سنائے جاتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ مصنف یا شاعر کا واہ واہ کا بھیک کی طرح دربدر مانگتے پھرنا ایک احمقانہ حرکت ہے اور ایک دفعہ جہاں کوئی ہتھے چڑھ گیا اور کان پر قابو پا لیا تو بس پھر بزاخفش کی طرح اس کے کان کے کیڑے تک جھڑا دیتے ہیں کبھی یہ حماقت یہ خبط کسی میں نہیں پایا میں تو اس یونانی حکیم کا ہم خیال ہوں جس نے صاحب علم کو منع کیا ہے کہ اپنی تصنیفات کسی کو نہ سنائیں۔ یہ سنانے کا شوق اور بیتابی ایک بدنما کمزوری ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہاں خوب یاد آیا یہ چند ناچیز اشعار ہیں جو نوجواں طبیعتوں کے لیئے لکھے گئے ہیں میں ان پر آپ کی رائے سننا چاہتا ہوں۔

تتر۔ آپ کے کلام میں ایسی خوبیاں ہوتی ہیں کہ اور کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

وا۔ حسن اور شاعری کی دیویاں آپ کے کلام کو دلکش بناتی ہیں۔

تتر۔ آپ کا اسلوب آزادانہ ہے اور الفاظ کا انتخاب جواب نہیں رکھتا۔

وا۔ آپ کے ہاں آمد کا بہاؤ ہے اور جذبات ہیں کہ امڈے پڑتے ہیں۔

تتر۔ ہم نے آپ کے قصیدے دیکھے ہیں۔ اسلوب کا حسن اور بندش کی نفاست ہیں ٹھوکر ہی نس اور وجل بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔

وا۔ آپ کے قصیدے اعلیٰ جذبات اور عاشقانہ رنگ میں ہاریں سے کہیں آگے ہیں۔

تتر۔ آپ کے لی یرک سے کوئی شے بہتر ہو سکتی ہے۔

وا۔ آپ کی سانٹ (ہفت بیتی) سے کوئی چیز لگا کھا سکتی ہے۔

تتر۔ آپ کے ننھے مثلث سے زیادہ کسی کلام میں حلاوت آ سکتی ہے۔

وا۔ آپ کے مستزاد میں جو ظرافت اور ذہانت ہوتی ہے وہ کسی اور کے ہاں کب ملتی ہے؟

تتر۔ خصوصیت کے ساتھ ترجیع بند آپ کا حصہ ہے۔

وا۔ آپ کا مرصع کلام پرستش کے قابل ہے۔

تتر۔ کاش فرانس کو آپ کی قدر ہوتی۔

وا۔ کیا ہی خوب ہوتا کہ زمانہ طباعی کے ساتھ انصاف کرتا۔

تتر۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک نہ ایک دن سنہری بگی میں پھرا کرو گے۔

وا۔ ہم دیکھیں گے کہ لوگ تمہارے بت کھڑے کریں گے۔ آہا حسن اتفاق

سے یہ ایک ترجیع بند جیب میں پڑا رہ گیا۔ براہ کرم اس پر میری استدعا ہے کہ بیلاگ . . . .

تھر۔ آپ نے وہ چھوٹی سی سانٹ (ہفت بیتی) بھی دیکھی شہزادی پورانی کے بخار پر۔

و ا ۔ ہاں ۔ کل کسی نے ایک محفل میں سنائی تھی۔

تھر۔ آپ کو معلوم ہے وہ کس کی ہے؟

و ا ۔ نہیں ۔ لیکن اتنا مجھے خوب معلوم ہے کہ سچ پوچھئے تو یہ سانٹ (ہفت بیتی) لغو بھی ہے۔

تھر۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک تحفۂ نظم ہے۔

و ا ۔ تو کیا ہوا! لوگوں کا خیال ایک چیز کو لچر ہونے کے سے نہیں باز رکھ سکتا ہے آپ نے اگر اس نظم کو دیکھا ہوتا تو آپ بھی میرے ہم زبان ہوتے۔

تھر۔ اس معاملہ میں یقین مانئیے میں ایسا ہرگز نہ کرتا گنتی کے ہی آدمی ہوں گے۔ جو ایسی نظم لکھ سکیں۔

و ا ۔ خدا مجھ سے ایسی خرافات نہ لکھوائے۔

تھر۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر چیز نہیں لکھی جا سکتی اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ اس نظم کا لکھنے والا میں ہوں۔

و ا ۔ آپ؟

تھر۔ ہاں میں۔

و ا ۔ مجھے اچنبا سا ہے۔

تھر۔ واقعہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے اس نظم میں کوئی بات آپ کے مذاق کی نہ ہوگی اس لئے آپ کو لطف نہیں آیا۔

وا۔ آپ نے کچھ تو مجھ سے نہیں سنا ہوگا۔ یا پڑھنے والے نے بگاڑ کر پڑھا ہو
خیر اس مضمون کو بدلیئے اور پھر سے ترجیع بند کو لیجئے۔

تشر۔ بات یہ ہے کہ ترجیع بند ایک پھیکی سی چیز ہوتی ہے اور اب تو اس کا رواج
بھی نہیں رہا۔ اس میں سے کچھ پرانے پن کی بو باس آتی ہے۔

وا۔ تاہم بہت سے لوگ ترجیع بند کو دلکش سمجھتے ہیں۔

تشر۔ تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کی رائے مجھے خرافات سمجھنے سے
باز رکھے۔

وا۔ محض آپ کے سمجھنے سے کوئی یہ صنف سخن بری ہونے سے تو رہی۔

تشر۔ البتہ ترجیع بند دکھاوے کے شاعروں اور عالموں کے لئے دلکش
ضرور ہے۔

وا۔ لیکن باوجود اس کے بھی آپ اسے پسند نہیں فرماتے۔

تشر۔ تم ناسمجھی سے اپنی برائیاں اوروں پر ڈالتے ہو

وا۔ تم گستاخانہ طور پر اور اپنے معائب اوروں کے سر چپیتے ہو۔

تشر۔ دفان ہو یہاں سے۔ بہک منگا گدھا تیرے قلم کو گھس گھس کے
سوا اور کیا آتا ہے۔

وا۔ منہ کالا کرنے کا مضمون نگار اس شریف پیشہ کا بدنما داغ۔

تشر۔ لمبا بن اوروں کی کتابیں اپنا نام سرقہ کرے اور وہ بھی ہاتھ میں
چراغ لے کر۔

وا۔ دور ہو مسخرا۔

فلا۔ صاحبو بس جانے دیجئے۔ آخر آپ کا اب منشا کیا ہے؟

تشر۔ جا۔ جو شرمناک چوریاں یونانی اور لاطینی مصنفوں کی ہیں اس کا بدلہ

یہ کر کہ چپنی بھر پانی میں ڈوب مر۔

و ا۔ جا۔ ہارین کے اشعار کا جو خون کیا ہے اس کا بدلہ یوں کر کہ دیوار سے سر پھوڑ لے۔

تر۔ اپنی کتاب کو بھول گیا۔ کیسی مری پیدا ہوئی۔

و ا۔ اور تو نے فراموش کر دیا کہ تیری کتابیں جس مطبع میں چھپیں اس کا دوالہ پٹ گیا۔

تر۔ میری شہرت قایم ہو چکی ہے اس کو اب کون مٹا سکتا ہے۔

و ا۔ خیر جاتا کہاں ہے میرے دوست ہجو گو کے تجھے نہ حوالے کیا ہو تو جب کہنا۔

تر۔ اور میں بھی تجھے اس کے حوالے کرونگا۔

و ا۔ لیکن منہ دہو رکھو مجھے معلوم ہے کہ وہ میری نسبت عمدہ رائے رکھتا ہے جہاں کہیں مجلس میں مٹ بھیڑ ہو جاتی ہے تو وہ بے تکلفی سے میری پسلیوں میں ہلکے سے انگلی بہونک دیتا ہے لیکن تمہارا کسی نظم میں پیچھا نہیں چھوڑتا اس لئے تیر ہمیشہ تم کو ہی نشانہ بناتے ہیں۔

تر۔ یہی تو وجہ ہے کہ میرا اعجاز زیادہ ہے تم کو معمولی لوگوں میں شمار کرتا ہے ان غیر ممتاز لوگوں میں جن کا وجود توجہ کے لائق نہیں ایک وار تمہارا کام تمام کر دینے کو کافی تھا اور پھر کبھی اس نے دوسرے وار کی تمہیں عزت نہیں بخشی لیکن مجھ سے دست بدست ہوتی ہے جیسا کہ معزز مخاصمین کا دستور ہے وہ جانتا ہے کہ میرے مقابل میں اپنا سارا زور لگانا پڑے گا۔ اس کے وار طرح طرح سے اور مختلف سمتوں سے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ اسے کبھی اپنی جیت کا یقین نہیں آتا۔

وا۔ میرا قلم تمہیں دکھا دیگا کہ میں کس قسم کا انسان ہوں۔
تھر۔ اور میرا یہ ثابت کر دے گا کہ میں تمہارا استاد ہوں۔
وا۔ بھری محفل میں ٹوکتا ہوں کہ نظم و نثر یونانی لاطینی جس میں چاہو مقابلہ کو موجود ہوں۔
تھر۔ بہت خوب کبھی تو تم بارہین کی دکان میں اکیلے ہاتھ لگو گے۔

سین چوتھا

ترسوتین۔ فلامنت ارماند بلیس آنریت۔

تھر۔ میں غصہ میں آگ بگولا ہوجاتا ہوں آپ خیال نہ کریں۔ مجھے تو اس پر آگ لگی کہ آپ نے جو میری سانٹ (ہفت بیتی) کے متعلق رائے قایم کی اس پر حملہ کیا جائے۔

فلا۔ میں اس بات کی کوشاں رہوں گی کہ آپ دونوں میں مصالحت ہو جائے۔ خیر اب اور کوئی تذکرہ کیجئے۔ آنریت ادھر آؤ مدت سے مجھے الجھن ہے کہ تم میں ذہانت اور طباعی کی کوئی تو علامت ظاہر ہو۔ میں نے اب ایک تدبیر سوچی ہے جس سے یہ چیز تم میں پیدا ہو جائیگی۔

آن۔ آپ خواہ مخواہ میرے بارے میں اتنی پریشانی اٹھاتی ہیں علمی ذکر اذکار میرے حصہ میں نہیں آئے ہیں تو سیدھی سادی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ ہر وقت اسی سوچ بچار میں رہنا کہ کوئی پھڑکتی پھڑکانے والی بات کہی جائے ایک وبال ہے میرے دماغ میں اس قسم کا شوق و ذوق آنے نہیں پاتا۔ اماجان میں اپنی کوڑمغزی پر شاکر ہوں میں تو اسی طرح کی بول چال پسند

کرتی ہوں جو اور لوگ عموماً بولتے ہیں۔ مجھے نفیس نفیس علمی زبان سے اُلجھن سی ہوتی ہے۔

فلا۔ اور یہی تو وہ بات ہے جس نے میرے دل میں گھاؤ ڈال دیئے ہیں اپنے ہی گوشت پوست لختِ جگر سے مجھے اس رسوائی کی ہرگز توقع نہ تھی حسنِ صورت سطحی ہوتا ہے اس کی جڑیں جلد کے نیچے نہیں جاتیں وہ ایک بودا زیور ہے ایک پھول مرجھانے والا۔ گھڑی بھر کی طمطراق ہے حسنِ باطن مضبوط اور پائدار ہوتا ہے اسی لئے مجھے اس بات کی تلاش تھی جس سے تم میں وہ حسن بھی نمودار ہو جسے زمانہ مٹا نہیں سکتا سوچتی تھی کہ ایسا ذریعہ ہاتھ لگ جائے جس سے تمہارے دل میں علم و فضل کا شوق پیدا ہو اور تم بھی علمی زیور سے بن سنور جاؤ۔ قصہ مختصر میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ تمہیں کسی زبردست عالی دماغ آدمی کے پلے باندھ دوں اور یہ سوسو وہ آدمی ہیں اور میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ اب ان کو اپنا دولہا سمجھو جس کو میں نے انتخاب کیا ہے۔

آن۔ اماں جان میں۔

فلا۔ ہاں تم اور کون۔ اب کوئی دن جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو جان بوجھکر سِٹرن بنانا بھول بھال جاؤگی۔

جل۔ ہاں میں تاڑ گئی! تمہاری آنکھیں میری اجازت کی طالب ہیں کہ آپ اپنا دل جواب تک میرا تھا کسی اور کے حوالے کریں۔ ہاں شوق سے ایسا کیجئے میں بخوشی اجازت دیتی ہوں میں آپ کو ان نئی زنجیروں کے سپرد کئے دیتی ہوں۔ اس شادی سے آپ کے سب معاملات سُلجھائیں گے۔

تھر۔ بیگم صاحب مجھے اپنی خوشی کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے اِس رشتہ

جس کی بجھے عزت حاصل ہوئی ہے۔

آن۔ ذرا رسان رسان وہ وقت تو آجائے ابھی یہ بات طے نہیں ہوئی ہے اتنی جلد بازی نہ کیجئے۔

فلا۔ یہ بھی کوئی جواب ہے؟ تم جانتی ہو خیر تم میرا مطلب سمجھ گئیں۔ آیئے ان کو تنہائی میں سوچنے کا موقع دیں۔ یہ اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔

سین پانچواں

آنریٹ ارمانڈ

ار۔ اماں نے تمہارے لئے بر تو خوب ڈھونڈا اس سے زیادہ ممتاز شوہر ملنا مشکل ہے۔

آن۔ اگر یہ انتخاب اس قدر عمدہ ہے تو تم کیوں نہیں قبول کر لیتیں؟

ار۔ اس کی نسبت مجھ سے نہیں، تمہارے ساتھ ٹھہرائی گئی ہے۔

آن۔ میں خوشی سے تمہاری نذر کرتی ہوں۔ آخر تم میری بڑی بہن ہو۔

ار۔ اگر خانہ آبادی مجھے اس قدر پسند ہوتی جتنی تم کو پسند ہے تو میں تمہاری اس نذر کو قبول کرتی اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتی۔

آن۔ میرے سر میں مصنوعی علم و فضل کا سودا تمہاری طرح ہوتا تو میں ایسے آدمی کو ضرور ایک نہایت موزوں شوہر خیال کرتی۔

ار۔ خیر۔ اس بارے میں میرا اور تمہارا مذاق جدا جدا نہ ہے لیکن بہن ہمارا فرض ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کریں ماں کو بیٹیوں پر پورا پورا اختیار ہے

اور خواہ مخواہ تم ماں کی مرضی کے خلاف . . . .

سین چھٹا

کریسال - اریست کلتاندر آنریت ارماند

کری - آؤ بیٹی - تم کو ضرور میری رائے سے اتفاق ہونا چاہیئے - واستانے اتار دو اور مسوسو کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دو اور یاد رکھو کہ یہ میری عین مرضی ہے کہ تم اپنے آپ کو آج سے ان کی بیوی سمجھو -

ار - بہن اس جانب تو خود تمہارا بہت ہی زبردست میلان ہے -

آن - بہن ہم کو اپنے ماں باپ کا حکم ماننا چاہیئے باپ کو اپنی بیٹی کے ہر فعل پر اختیار حاصل ہے -

ار - ماں کو بھی یہ حق ہے کہ تم سے فرمانبرداری کی اُمید رکھے -

کری - اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟

ار - مطلب یہی ہے کہ آپ اور اماں جان اس معاملہ میں ہم خیال نہیں ہیں - انھوں نے اور ہی شوہر . . . .

کری - چپ رہو - باتونی افلاطون کی بچی اپنی اماں کے ساتھ ہی جتنی جی چاہے فلاسفی بگھارو میرے کاموں میں خبردار جو دخل دیا - اپنی اماں جان کو خبردار کر دو کہ میرا منشا کیا ہے اور یہ جتلا دو کہ مجھے غصہ دلانا ٹھیک نہیں جاؤ تم ابھی یہ پیغام پہونچا دو -

اریست - کیا کہنے - بھائی تم تو عجب مزے دکھار ہے ہو -

کل۔ میری خوشی کی حد نہیں۔ میری خوش نصیبی میں شک نہیں۔
کری۔ آؤ آنربیت کا ہاتھ لو اور ہمارے آگے آگے چلو اور کمرہ تک پہونچا دو ہائے کیا مزے کے چاؤ پیار ہیں اُن کی محبت کی گرما گرمی دیکھ کر میرے دل میں گرمائی آتی ہے میں اپنے کو جوان پاتا ہوں اور مجھے خود اپنے عشق و عاشقی کا زمانہ یاد آتا ہے۔ آؤ بھائی۔

ایکٹ چوتھا

سین پہلا

ارمانڈ — فلامنت

ار۔ ہاں ہاں اسے ذرا بھی تو تامل نہیں ہوا۔ اور الٹی اپنی سعادتمندی پر فخر کر رہی تھی۔ اتنی بھی تو مہلت نہیں دی کہ دل بیچارے کو ابا کی اجازت کا احساس ہوے اُس نے تو میری آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو آغوش میں دیدیا۔ اس کی حرکات سے یہ بات مترشح ہوتی تھی کہ ابا کے حکم ماننے کا تو اتنا زیادہ خیال نہیں جتنا ماں کی مرضی کے خلاف کرنے میں مزہ آرہا ہے۔
فلا۔ جاتی کہاں ہے۔ میں دکھا دونگی کہ عقل کے قوانین ہم دونوں میں سے کس کی اطاعت پر مجبور کرتے ہیں آیا اس کو باپ یا ماں کس کے کہنے پر چلنا پڑتا ہے۔ نفس یا بدن۔ روح یا مادہ کس کی آخر میں جیت رہتی ہیں۔
ار۔ کم سے کم ابا اور آنربیت کو آپ کا اتنا احترام تو لازم تھا کہ آپ سے

مشورہ تو کر لیتے یہ نوجوان صاحب بھی عجیب آدمی ہیں کہ آپ مانیں یا نہ مانیں وہ
ہیں کہ آپ کے داماد بننے پر تلے ہوئے ہیں۔

فلا۔ ابھی کوئی اُن کے دل کی مراد تو آئی نہیں ہنوز دہلی دور است میں
اس شخص پر کافی غور کر چکی ہوں میں اس بات سے تو خوش تھی کہ وہ تم سے محبت
جتلائے لیکن اُس کے اطوار مجھے کبھی نہیں بھائے اس کو اتنا تو معلوم ہی
تھا کہ خدا کے فضل سے مجھے تصنیف و تالیف میں کچھ دخل ہے میں کچھ نہ کچھ
لکھ لیتی ہوں اور کبھی منہ پھوڑ کر ایک دفعہ بھی یہ استدعا، نہ کی کہ اپنی کوئی تحریر
سنائیے۔

سین دوسرا

کلمانڈر   ارمانڈ   فلامنت

ار۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو میں ایک لمحہ بھی اس کی روادار نہ ہوتی کہ یہ
شخص آنریٹا کو بیاہ لیجائے۔ یہ میرے حق میں ناانصافی ہوگی اگر یہ خیال کیا جائے
کہ میں اپنے کسی مطلب سے ایسا کہہ رہی ہوں یا یہ کہ اس نے جو رذیل حرکت
اور چالبازی میرے ساتھ کی ہے اس کی وجہ سے کوئی دشمنی کی آگ میرے
دل میں دبی ہوئی ہے روح ایسے حملوں اور صدموں کے لیئے فلاسفی کا قلعہ
مہیا کر دیتی ہے اور انسان اس طرح دنیا کی ایسی باتوں سے بالاتر ہو جاتا ہے
مجھے تو رہ رہ کر اس کا خیال آتا ہے کہ آپ کے ساتھ اس طرح سلوک کرنے سے
کہیں آپ کو بھی ضد نہ آجائے اور حد سے زیادہ غصہ میں آپ کہیں اپنی
بات پہ بالکل اڑ نہ جائیں یہ بات تو اب اس نوبت کو پہونچ چکی ہے کہ زبان

لی لاج آپ کو اسی پر مجبور کرے گی کہ آپ اس نسبت کو توڑ ڈالیں۔ یہ شخص بھی ایسا ہی واقع ہوا ہے کہ آپ کبھی اس سے خوش نہیں ہوں گی۔ بس یہ بات آپ ہی تک رہے کہ مجھے جہاں تک معلوم ہے اس شخص کے دل میں آپ کی ذرا بھی تو وقعت نہیں ہے۔

فلا۔ نالائق گدھا کہیں کا وہ ہے ہی کیا؟

ار۔ کتنی ہی آپ کی شہرت اور ناموری کی باتیں ہوتیں۔ مگر اس اللہ کے بندے نے کبھی گرمجوشی سے تعریف نہیں کی۔

فلا۔ گنوار۔

ار۔ اور بیسوں دفعہ اتفاق ہوا کہ میں نے آپ کا تازہ کلام اس کو سنایا اور اُس نے کبھی پسند نہیں کیا۔

فلا۔ گستاخ۔

ار۔ مجھ سے ہمیشہ اسی پر حجت ہوتی تھی آپ کو یقین نہیں آسکے گا کہ کیا کیا بیہودہ . . . .

کلتا ندر۔ (اب تک چھپا ہوا سن رہا تھا) ذرا تو خدا سے ڈرو انسانیت بھی کوئی شئے ہے یا کم از کم ایمان تو ہاتھ سے نہ دو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں نے کونسا گناہ کیا ہے کہ تم اپنی چرب زبانی کا سارا زور میرے خلاف صرف کر رہی ہو؟ تم چاہتی ہو کہ مجھے برباد کردو اور مجھے ان لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور قابل تمسخر بنا دو جن کی خوشی مجھے اس وقت درکار ہے؟ آخر کہو تو یہ غصہ کی آتش فشانی کیوں! میم صاحب آپ ہی ہم دونوں میں منصفی کریں۔

ار۔ اگر واقعی مجھے اس قدر غصہ ہوتا جتنا تم سمجھے ہوئے ہو تو میں کافی وجوہات پیش کرتی کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں اس میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

تم اس کے ہر طرح سزاوار ہو۔ پہلی محبت روح پر ایسا مقدس استحقاق قایم کردیتی ہے کہ لوگ دھن دولت اور جان تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اس محبت کو کسی اور محبوبہ کے سورتی پر بھینٹ نہیں چڑھاتے۔ دنیا میں اس سے زیادہ چیز ہے نہیں کہ آدمی اپنے محبت کے قول و قرار اور قسما قسمی سے پھر جائے۔ ایسا بیوفا دل حسن اخلاق پر ایک بدنما ستا ہے۔

کل۔ خود تمہارے غرور نے مجھے جو ایک بات پر مجبور کیا تو کیا اس کو طوطا چشمی کہنا بجا ہے؟ میں تو وہی بات کر رہا ہوں جو تمہارے غرور کا فرمان تھا۔

اور اب اگر اس سے تم ناراض ہو تو یہ سارا تمہارے غرور کا قصور رہے تمہاری دلربائیوں نے پہلے پہل میرے دل پر قبضہ کیا۔ دو سال تک میری محبت کے شعلے تمہارے لیے بھڑکتے رہے خدمت گزاری، بلا ناغہ حاضر باشی، احترام اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو تمہاری محبت کے نذر نہ کی گئی ہو لیکن یہ عشق یہ حاضر باشی وفاداری تمہاری نظر میں کچھ مال نہ تھیں تم ہمیشہ میری محبت کے خلاف باتیں کرتی رہیں۔ جس دل کو تم نے ناک بھوں چڑھا کر رد کر دیا وہ میں نے دوسرے کے سامنے پیش کیا۔

اب میلام غور کیجیے کہ کیا اس میں قصور میرا ہے؟ میرے دل نے اپنا آپ رنگ بدلا یا یہ کہ تم نے اسے چرکے لگا لگا کر اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اور صورت اختیار کرے؟ کوئی انصاف سے دیکھے تو کہہ اٹھیگا کہ میں اپنے آپ تمہاری بارگاہ حسن سے نہیں گیا بلکہ تم نے مجھے دھکے دے دے کر نکالا۔

ار۔ ہو سو تمہاری محبت کے خلاف میں نے کیا باتیں کیں؟ تمہارا

اشارہ اس جانب ہے کہ میں عشق کو اس کے رکیک عناصر سے پاک کرنا چاہتی تھی۔ اور میرا انشا تھا کہ محبت چھن چھنا کر ویسی خالص ہو جائے کہ اس کا اصلی اور کامل حسن چمکنے لگے؟ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے محبت کے جذبات کو حواسوں کے جھمیلوں اور لین کی باتوں سے سلجھا سلجھایا اور صاف ستھرا رکھو؟ کیا تم اس لفیس دلوں کے اتحاد کی عجیب دلفریبی کو نہیں محسوس کر سکتے تھے جس میں جسم کو دخل نہیں؟ کیا تم نری حواس والی لذتوں اور اس کے مادی تعلقات کے طمطراق کو ہی محبت تصور کر سکتے تھے؟ جو آگ میں نے تمہارے دل میں لگائی تھی اس کے بجھانے کے لئے کیا بیاہ ان تمام چیزوں کے ساتھ جو اس کے لوازمات ہیں ضروری ہی تھا۔ افسوس محبت کا کس قدر عجیب تصور ہے اعلیٰ اور ارفع ہستیاں اُن زمینی شعلوں کی آنچ سے بہت دور ہوتی ہیں اُن کے عشق و عاشقی میں حواسوں کو بار نہیں ملتا ان کا میل ملاپ بعض روحانی ہوتا ہے اور سب باتیں اس درگاہ سے مردود قرار دلائی جاتی ہیں آسمانی انوار کی طرح عشق کی آگ ایک خالص اور ستھری چیز ہے اس کا خیال وہی کرتے ہیں جن کی آہیں نیکی اور پاک خیالی میں ڈوبی ہوی ہوں گندی خواہشات کا کوئی لگاؤ نہ ہو اس کا مقصد ایسا ہوتا ہے جس میں نام کو کھوٹ یا کوڑا ملا نہ ہو۔ ایسا عشق محض عشق کی خاطر ہوتا ہے اور کسی مطلب سے سروکار نہیں ہوتا۔ اسکی وجدانی کیفیتیں روح کے لئے ہوتی ہیں اس کو جسم جیسی شئے کے وجود کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

کل۔ بیم صاحب مجھے معاف فرمایئے کہ میں بدقسمتی سے اس بات کا اِدراک رکھتا ہوں کہ روح کے ساتھ میرا جسم ہی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ یہ جسم روح سے اس قدر وابستہ ہے کہ دونوں کو جدا جدا تصور ہی نہیں

کیا جا سکتا ہے وہ فلسفیانہ کمال جس سے ان کو جدا کیا جاتا ہے۔ مجھکو حاصل نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے مجھے اِس قسم کی فلاسفی سے محروم رکھا ہے اور میری روح اور میرا جسم ہر کام میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں جیسا ابھی تم نے کہا ان چھنی چھنائی ستھری خواہشات سے جو صرف ایسی جگہ ہو سکتی ہیں جہاں روح ہی روح کا راج ہو، جہاں اس طرح دل ملے ہوں ایسی خالص محبت چھائی ہو کہ حواسوں کے دین لین کا خیال تک باقی نہ رہے ان خواہشات سے حسین تر کوئی شئے نہیں ہو سکتی لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ایسی عشق و عاشقی میرے بس کی چیز نہیں میری روح حواسوں کے زنگ سے اتنی نہیں منجھی کہ میں اس راستہ پر ڈگمگا نہ جاؤں۔ میں ذرا جیسا کہ آپ نے اِشارہ فرمایا ہے رکیک مزاج ہوں میری سرشت مادیت لئے ہوئے ہے میں کسی کو چاہتا ہوں تو اپنی پوری سرشت سمیت۔ رُوح اور جسم دونوں اس میں شامل ہوتے ہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ کسی سے محبت کے معنے ہیں کہ میری خواہشات اس کی کل ہستی۔ روح اور جسم دونوں کو اپنا بنانا چاہتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اسے گناہ یا جرم سمجھا جائے تمہارے خیالات بہت ہی اعلیٰ ہیں میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ میرا طریقہ وہی ہے۔ جس پر عموماً دنیا کے لوگ عمل پیرا ہیں شادی خاصی فیشن میں داخل ہے اور ہر جگہ بلا تامل اس تعلق کو ایک مستحسن اور نازک رشتہ کہا اور سمجھا جاتا ہے اسی وجہ سے میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ تمہیں اپنی بیوی بناؤں اور اس کا مجھے حاشا وکلا گمان بھی نہ تھا کہ اس خیال سے آپ ناراض ہو جائینگی۔

ار۔ خیر ہو سو خیر رمفی مامفی۔ چونکہ تمہاری حواس والے خواہشات

اِس قدر مصر ہیں کہ ان کو پورا کیا جائے اور میری ایک حجت پیش نہ کیجائے۔ اور تم کو وفاداری کے راستہ پر لگائے رکھنے کے لئے گوشت پوست کی رسیوں میں باندھنا اٹل ہے۔ اگر میری اماں جان بھی رضامند ہوں تو میں کوشش کروں گی کہ اپنی روح کو تمہاری خواہشات کی خاطر اس بات پر بھی آمادہ کر لوں۔

کل۔ میڈم اب وقت ہاتھ سے جا چکا۔ اب دوسری نے دل میں جگہ کر لی ہے۔ اب میں ایسا کروں تو یہ شفقت اور دلجوئی کا نہایت ہی برا معاوضہ ہوگا۔ جو اس دوسرے نے میرے ساتھ کی کس قدر اس سے صدمہ پہونچیگا ان محبت آمیز احساسات کو جنھوں نے مجھے تمہارے آخرت کے ساتھ دینے کے بعد پناہ دی اور میری دلداری کی۔

فلا۔ لیکن موسو اگر تمہارا یہ خیال اِس بھروسہ پر ہے کہ میں اس دوسری نسبت پر رضامند ہو جاؤں گی تو یہ خیال اپنے دل سے نکال ڈالئے کبھی تم نے اس کا بھی خیال کیا کہ میں نے آنریت کے لئے ایک اور بہتر شوہر ڈھونڈ رکھا ہے۔

کل۔ خدا کے لئے مہتم صاحب اپنے انتخاب پر دوبارہ غور فرمائیے مجھے اس درجہ ذلیل نہ کیجئے کہ موسو ترسوتین جیسے شخص کا مجھے رقیب قرار دیا جائے آپ کے ہاں جو غلط طور پر علم و فضل اور کلچر سمجھا جاتا ہے اس لے اُس شخص کو میرا مدمقابل بنا کر کھڑا کر دیا ہے حالانکہ میرا مدمقابل اس سے زیادہ کم پایہ شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا زمانہ کی بدمذاقی نے بہت سے نااہل لوگوں کو اہل قلم کا لقب دے رکھا ہے لیکن موسو ترسوتین تو ان لوگوں میں سے ہے جس سے اس بدمذاقی کے دور میں بھی کسی متنفس نے مغالطہ نہیں کھایا۔ ہر کس و

ناکس اس کے رشحاتِ قلم کی صحیح صحیح قدر و قیمت جانتا ہے اور اس گھر کے سوا ہر جگہ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ کتنے پانی میں ہے مجھے سخت حیرت ہوئی ہے یہ دیکھکر کہ آپ اس کی محض خرافات کی تعریف کے پل کے پل باندھ دیتی ہیں اس کا کلام اس قدر گرا ہوا ہوتا ہے کہ ایسا کلام اگر خود آپ کا بھی ہوتا تو آپ کو اس سے شرم آنے لگتی۔

فلا۔ موسیو سوتین کے بارے میں آپ کی رائے ہم سے جداگانہ ہے اور وہ اس لئے کہ ہم جس نظر سے اُن کو دیکھتے ہیں آپ نہیں دیکھ سکتے۔

سین تیسرا

تر سوتین۔ ارمانڈ۔ فلامنت۔ کلتاندر

تر۔ میں ایک عجیب و غریب خبر لایا ہوں۔ رات کو ہم تو سوتے رہے لیکن زمین ایک ہولناک مصیبت سے بال بال بچ گئی۔ ایک ستارہ ایک پوری دنیا کی دنیا ہمارے پاس سے ابھی گذر رہی تھی اور ہمارے زمین کے چکر میں کچھ گئی اگر اپنے زور میں وہ زمین سے ٹکرا جاتی تو ہماری یہ دنیا شیشہ کی طرح چکنا چور ہو جاتی۔

فلا۔ اس وقت اس بحث کو کسی اور موقع کے لئے اُٹھا رکھیئے یہ صاحب اس قسم کی باتوں کو بے سروپا کہیں گے اُن کو جہالت سے عشق ہے اور یہ اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ اُنہیں عقل و فراست اور علم و فضل سے نفرت ہے۔

کل۔ یہ بیان ترمیم کے قابل ہے میں اس کی وضاحت کرنی چاہتا ہوں میں اس علم و فضل سے ضرور نفرت کرتا ہوں جو آدمی کے دماغ کو سڑا دے۔

فراست بذلہ سنجی اور علم فی نفسہ عمدہ چیزیں ہیں لیکن جب میں اُن چند لوگوں کو دیکھتا ہوں جو علمیت بگھارتے اور جھوٹ موٹ کے بذلہ سنج بنتے ہیں تو میں اسی کو مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کے زمرہ میں سمجھوں۔

تر۔ لوگوں کا جو دل چاہے کریں کسی کی زبان کون پکڑ سکتا ہے لیکن مجھ سے پوچھئے تو علم و فضل ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے کوئی چیز بگڑ ہی نہیں سکتی۔

کل۔ اور میری رائے ہے کہ گفتار اور کردار دونوں میں علم و فضل بعض اوقات آدمی کو بہت بڑا بیوقوف بنا سکتا ہے۔

تر۔ یہ آپ کا دعویٰ اجتماع خلائق ہے۔

کل۔ میں منطقی تو ہوں نہیں البتہ اِس دعویٰ کا ثبوت دینا کچھ مشکل بات نہیں۔ اگر اِستدلال میرا ساتھ نہ بھی دے تو بھی مشہور و معروف مثالیں تو آسانی سے مل جائیں گی۔

تر۔ آپ مثالیں پیش کیجئے مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوئی ہے!

کل۔ مثال کے لئے مجھے دور دور تلاش کرنا نہیں پڑے گا۔

تر۔ یہ آپ کی مشہور و معروف مثالیں مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

کل۔ میں تو اُن کو اِس طرح صاف دیکھ رہا ہوں کہ میری آنکھیں چندھیا سی گئی ہیں۔

تر۔ میرا تو اب تک یہ عقیدہ تھا کہ علم نہیں بلکہ جہالت انسان کو بیوقوف بناتی ہے۔

کل۔ آپ بڑی غلطی پر تھے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک عالم فاضل گدھا ایک اَن پڑھ گدھے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

تر۔ عامتہ الناس کا خیال آپ کے دعوؤں کے منافی ہے کیونکہ جاہل اور بیوقوف مترادف الفاظ پر سمجھے جاتے ہیں۔

کل۔ اگر آپ بیوقوف کے عام معنے لینا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ گندم نما جو فروش عالم اور بیوقوف میں بہت قرابت قریبہ ہے۔

تر۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ایک میں خالص حماقت جھلکتی ہے۔

کل۔ دوسرے میں علم و فضل فطرتی عطیہ کمی کو اجال دیتے ہیں۔

تر۔ علم و فضل محض بہ حیثیت علم و فضل بیحد بڑی قیمتی چیزیں ہیں۔

کل۔ ایک عقل کے کوزہ میں علم ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔

تر۔ جہالت میں آپ کے لئے ضرور کچھ دلفریبی ہے کہ آپ اس کی حمایت میں ہتھیار اٹھائے پھرتے ہیں۔

کل۔ اگر جہالت سے مجھے دلبستگی ہوگئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے چند صاحب علم لوگوں کی حرکات کا مطالعہ کیا ہے۔

تر۔ جن چند صاحب علم لوگوں، کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اُن سے زیادہ واقفیت ہونے کے بعد آپ ان کو یہاں جو لوگ اِس وقت موجود ہیں ان سب سے بدرجہا بہتر پائیں گے۔

کل۔ ہاں یہ چند صاحب علم لوگ، اپنے متعلق جو کچھ کہتے ہیں ان کو اگر صحیح مان لیا جائے۔ لیکن بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو محض اُن کے زبانی جمع خرچ پہ کبھی نہیں جاتے۔

فلا۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے۔

کل۔ میم صاحب اس کی سند نہیں۔ میرے حال پر بھی رحم فرمائے۔ سو بغیر کسی حمایتی کے خاصے مضبوط اور میرے ایک زبردست مدِ مقابل ہیں۔ مجھے تو اپنی تمام قوت اس میں صرف کرنی پڑ رہی ہے کہ صحیح و سلامت پسپا ہو جاؤں ار۔ لیکن ہر دار کی تیزی اور ہر جواب کی برچھی۔

کل۔ لیجئے یہ ایک اور طرفدار پیدا ہو گئیں۔ اب میں اس کھیل میں ہار مانے لیتا ہوں۔

فلا۔ اس قسم کے دو دو ہاتھ صحبتوں میں مذموم نہیں البتہ شرط یہ ہے کہ ذاتیات معرضِ بحث میں نہ آنے پائیں۔

کل۔ برائے خدا آپ ہی کہئیے کہ کوئی بات ایسی میرے منہ سے نکلی جو ان صاحب کی ناراضی کا باعث ہو۔ یہ مذاق اور دل لگی کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ جنگ آزمودہ ہیں بہت سے تیر کھا چکے ہیں اور ان کے تفاخر کی یہ خاص خوبی ہے کہ اِن سب باتوں کو اُنھوں نے ہنسی میں ہی اُڑایا۔

تر۔ میں جس لڑائی میں سرگرم پیکار ہوں سو اس میں جو خود آپ حصہ لے رہے ہیں اس سے پہلے مجھے حیرت ہوتی تھی مگر میں اب ایسا دیکھتا ہوں کہ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں یہ درباری زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس بات سے مخالفت کا سارا راز آشکارا ہو جاتا ہے یہی دربار شاہی سب جانتے ہیں علم و فضل کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا مفاد اس میں رہے کہ جو حالت کی تائید کی جائے اور یہ بہ حیثیت درباری ہونے کے دربار کے اپنے آپ جانب دار ہیں۔

کل۔ بیچارے دربار پر آپ ناروا الزام دھرتے ہیں اس سے زیادہ اس کی کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ آپ جیسے صاحب علم روزانہ اِس کے خلاف

زہر اُگلتے رہیں ۔ اپنے کل مصائب کی وجہ آپ دربار کو قرار دیں اس کو بدمذاقی کا الزام دیں اور اپنی ناکامیابی کا جرم بھی اسی پر تھوپیں ۔ موسو ترسوتین مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ کا نام دور دور پھیل گیا ہے اور یہ زیادہ مناسب معلوم ہوگا کہ آپ اور آپ ہی کے قبیل کے لوگ دربار کے متعلق جو کچھ زبان آوری کریں وہ ذرا سوچ سمجھ کر کیجائے کیونکہ دربار درحقیقت اس قدر عقل سے معذور نہیں ہے جتنا آپ لوگوں نے اسے سمجھ رکھا ہے درباری حلقہ میں اتنی فہم عامہ موجود ہے کہ وہاں وسعت نظر کی قدر کی جائے مذاق سلیم بھی وہاں پایا جاتا ہے اور یہ میں خوشامد سے نہیں کہتا کہ وہاں دنیا داری کے امور میں جو دانشمندی پائی جاتی ہے وہ جھوٹ موٹ کے عالموں کے تاریک علم و فضل سے کہیں بہتر ہے ۔

تر ۔ موسو ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے مذاق سلیم کا ایک اوتار موجود ہے ۔

کل ۔ اچھا تو اب آپ ہی بتلائیے کہ آپ دربار کی بدمذاقی کن میں پاتے ہیں

تر ۔ اس بات میں کہ راسی اوس اور بالدوس دونوں علم و فضل کے مایۂ ناز ہیں ان کی قابلیت ہر ایک پر روشن ہے لیکن دربار ہے کہ بیچاروں پر توجہ نہیں کرتا نہ ان کی قابلیت کو تسلیم کرتا ہے نہ ان کے ساتھ فیاضی دکھاتا ہے ۔

کل ۔ اب میں سمجھا کہ آپ کس بات سے ناراض ہیں ۔ براہ کرم آپ تو اپنے آپ کو ان دونوں کے زمرہ میں نہ ملائیے اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو کم از کم محض اس خیال سے کہ ان کے ساتھ ناکام آنا باعث شرم ہے آپ کو اس حلقہ سے علیحدہ کرکے سوال یہ ہے یہ علم و فضل والے لوگ حکومت کی کیا خدمت کر رہے ہیں ۔ اپنی تحریروں میں وہ دربار پر انصاف کے خون کرنے کا الزام لگاتے ہیں وہ ہر جگہ یہ شکوہ و شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ حکومت ، ان کے علم و فضل کے باوجود ان کی فیاضانہ حمایت نہیں

کرتی۔ وہ پکارتے ہیں کہ ان کا علم و دانش فرانس کے لیئے ضروری ہے اور دربار کو ان کی کتابوں کی ضرورت ہے ان قلاش قلم کی گھس گھس کرنے والے کے ننھے دماغوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بس کتاب جہاں چھپی اور اس کی ایک نفیس جلد بندھ گئی اور پھر وہ حکومت کے لیئے ایک اہم چیز بن گئی ان پر یہ خبط بھی سوار ہے کہ سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ان کے قلم کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ جہاں ان کی تصنیف کا ذرا چرچا ہوا اسی وقت حکومت ان پر ہن برسانے لگے دنیا بھر کی آنکھیں ان پر لگی ہوتی ہیں اور ان کی شہرت ہر ملک میں پھیلی ہوئی ہے وہ اپنے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ علم و فضل میں ہمارا جواب نہیں محض اس لئے کہ وہ سب باتیں جانتے ہیں جواب تک اور مصنف کہتے آئے ہیں تیس سال سے وہ اس علم و فضل کو اکھٹا کرنے میں اپنی آنکھیں پڑھ پڑھ کر اور کان سنکر سنکر پھوڑتے رہے ہیں اور لاطین اور یونانی کو طوطے کی طرح رٹنے میں ہزاروں راتیں گزاری اور اپنے نفوس کو ہر طرح کے سڑے گلے کوڑے کرکٹ سے جو پرانی کتابوں میں ہاتھ لگا لاد لیا ہے یہ لوگ ہمیشہ اپنے علم و فضل کے غرے اور نشہ میں رہتے ہیں بس اس میں سے دیکئے قابلیت یہ رہجاتی ہے کہ ان کے بیہودہ بکھواس کے خزانہ کی کمی نہیں مگر یہ ساری بکواس دور از کار فہم عامہ سے خالی نا معقول جسارت سے لبریز ہوتی ہے اس کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی کو بذلہ سنج اور صاحب علم گردانتے ہی نہیں۔

فلا۔ اوہ آپ تو خوب اِس وقت گرم ہوگئے آپ کا غصّہ تو بہوت بُرا اس سے تمہارے طبعی رجحانات کا پتہ چلتا ہے اصل میں رقیب کے نام نے یہ ساری آگ . . . .

سین چوتھا

جولین۔ ترسوتین۔ فلامنت کلنتانذر ارمانڈ

جو۔ جو عالم ابھی آپ سے مل گئے ہیں اور جنھیں جن کا نوکر ہونیکا فخر حاصل ہے اُنھوں نے یہ چٹھی بھیجی اور ان کی التجا ہے کہ آپ میم صاحب اسے شروع سے آخر تک پڑھ لیں۔

فلا۔ خدا کتنا ہی ضروری ہو تم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے عین گفتگو کے دوران میں ٹپک پڑنا بدتمیزی کی بات ہے جو سمجھدار آدمی ہوتے ہیں وہ گھر کے آدمیوں سے دریافت کر لیتے ہیں اور بعد اندر قدم رکھتے ہیں۔

جو۔ میم صاحب میں آپ کی اس نصیحت کو اپنی کتاب میں درج کر لوں گا۔

فلا۔ (پڑھتی ہے) ترسوتین میم صاحب یہ شیخی کرتا پھرتا ہے کہ آپ کی لڑکی سے بیاہ ہوگا۔ میں آپ کو خبردار کئے دیتا ہوں کہ اس معاملہ میں اسکی فلاسفی کا مطمح نظر آپ کی دولت ہے اور یہ مناسب ہوگا کہ اس کے ساتھ آپ اپنی لڑکی کی شادی میری اس نظم کی تکمیل تک ملتوی کر دیں جو میں اس کے خلاف لکھ رہا ہوں۔ نظم کے پورے ہونے تک ذرا توقف ورکا رہوگا میں اس نظم میں اس کی ایسی تصویر کھینچ رہا ہوں جس میں اس کے اصلی خد و خال ظاہر ہو جائیں گے اس اثنا میں آپ کے مطالعہ کے لیے میں ہاریں ورجل ستے ریس اور کاتلوس کے کلیات آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں ان کے ہاں سے ترسوتین نے جہاں جہاں سے سرقہ کیا ہے وہاں حاشیہ پہ

نشان کر دیئے گئے ہیں۔

فلا۔ (بولتی ہے) میں جس شادی کو دل سے پسند کرتی ہوں اُس کے ظاہر ہوتے ہی ہر طرف سے دشمنوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ کسی طرح یہ میرا نیک ارادہ پورا نہ ہونے پائے آج جو کچھ برا بھلا کہا گیا ہے اس نے اب میرے دل میں یہ بات بٹھادی ہے کہ اس معاملہ میں جہاں تک ہو جلدی کرنی چاہیئے اس سے رشک اور حسد کرنے والے اپنا سا منہ لیکر رہجائیں گے۔ اور یہ معلوم کر کے ان کا دل اور جلیگا کہ انہوں نے جو کوشش اس کام میں روڑے لگانے کی کیں آنہیں ان کا نتیجہ ہوا کہ یہ کام اور جلدی سے طے پا گیا۔ جاؤ اپنے آقا سے یہ سب باتیں کہدو اور یہ بھی کہدینا کہ محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں کہاں تک ان کے بیلاگ مشورہ کی وقعت کرتی ہوں میں آج شام کو ان صاحب سے اپنی لڑکی کا عقد کئے دیتی ہوں۔ تم موسو ہمارے دوست کی حیثیت سے موجود رہوگے اور کابین نامہ پر بھی کو دستخط کرنی ہوگی۔ میری یہ خواہش ہے کہ شریک رہو۔

۔ دیکھو رجسٹرار کو کہلا بھیجو اور اپنی بہن کو ان سب باتوں کی خبر دو۔

ار۔ بہن کو خبردار کرنے کی ضرورت نہیں کلتا ندر صاحب یہ خبر اُن تک پہنچانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے . . . .

. . . .

فلا۔ دیکھا جائیگا کہ اس پر کس کا زور چلتا ہے اور معلوم ہو جائیگا کہ میں اسکو احساس فرض پر مجبور کر سکتی ہوں یا نہیں۔ (چلی جاتی ہے)

ار۔ موسو مجھے یہ دیکھکر بہت ملال ہو رہا ہے کہ معاملہ تمہارے حسب لخواہ

ہوتا نظر نہیں آتا۔

کل۔ میں بھی ناخنوں تک کا زور لگا دونگا تاکہ آپ کے دل کا یہ ملال جاتا رہے۔

ار۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی کوششوں کا خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

کل۔ انشاء اللہ آپ دیکھ لیں گی کہ آپ کا اندیشہ بے بنیاد تھا۔

ار۔ توقع کرتی ہوں کہ ایسا ہی ثابت ہو۔

کل۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا اور یہ کہ آپ بھی اس میں میری تائید اور امداد کریں گی۔

ار۔ ہاں ہاں یقین مانئے میں آپ کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھونگی۔

کل۔ اور آپ بھی یقین رکھیئے کہ ایسی خدمت گزاری کے بعد آپ میری شکرگزاری سے محروم نہ رہیں گی۔

سین پانچواں

کریسال ارییت آرزیت کلٹ انڈر

کل۔ سوسو بغیر آپ کی مدد کے مجھے کامیابی نظر نہیں آتی آپ کی بیوی نے میرے پیام کو رد کر دیا ان کا دل مجھ سے مکدر رہے اور وہ ترسوتین کو داماد بنانا چاہتی ہیں۔

کری۔ اس کا نام لاطین کا قافیہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اور لوگوں پر

اس کو ترجیح دیجاتی ہے۔

کل۔ آج شام کو وہ نکاح کر دینا چاہتی ہیں۔

کری۔ آج ہی شام کو؟

کل۔ جی ہاں۔

کری۔ اور میں آج ہی سہ پہر کو تم دونوں کا عقد کئے دیتا ہوں محض اسکی ضد پر۔

کل۔ اُنھوں نے رجسٹرار کو بلا بھیجا ہے کہ کابین نامہ تیار ہو جائے۔

کری۔ اور میں خود جا کر اسے لئے آتا ہوں اور دستاویز لکھوائے لیتا ہوں۔

کل۔ آنریت کو ان کی بڑی بہن اس کی اطلاع دینے گئی ہیں اور یہ کہنے کہ اس بیاہ پر جس طرح ہو آمادہ ہو جاؤ۔

کری۔ اور میں باپ کی حیثیت سے اُسے حکم دیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بیاہ کرنے کو تیار ہو جائے ہاں اب میں ان سب کی آنکھیں کھولدینی چاہتا ہوں۔ کہ اس گھر میں سوائے میرے اور کسی کا حکم نہیں چل سکتا ہیں اس گھر کا آقا ہوں آؤ بھائی اور میرے داماد تم بھی آؤ۔

آن۔ کاش اَبا جان کا مزاج اسی طرح زوروں پر رہے۔

اریست۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے لئے کسی بات میں دریغ نہیں کروں گا۔

کل۔ اگرچہ یہ میرے معاملہ میں بڑی زبردست امداد کے وعدہ دھیئے ہیں لیکن آنریت مجھے سب سے زیادہ توقع تمہیں سے ہے۔

آن۔ تم اطمینان رکھو میرا دل تمہارا ہی ہے۔

کل۔ اس اطمینان کے بعد بس میں مطمئن ہوں۔

آن۔ آخر تم نے دیکھ لیا کہ مجھے کہاں جھونکنا چاہتے ہیں۔
کل۔ یہ دل جبتک میرا ہے مجھے کسی بات کا خدشہ نہیں۔
آن۔ میں اپنی تمام کوششیں اس میں صرف کردونگی میری کوئی کوشش پیش نہ گئی اور میں تمہاری نہ ہو سکی۔ تو پھر میں نے اپنی روح کو تسکین دینے کی بھی ایک جگہ سوچ رکھی ہے جہاں میں پھر کسی کی بھی نہ ہو سکونگی۔
کل۔ خدا نہ کرے کہ ایسی صورت پیش آئے اور تم اپنی محبت کا ایسا ثبوت پیش کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔

ایکٹ پانچواں

آنریت ۔ ترسوتین

آن۔ موسیو میں اماں جان نے جو اس بیاہ کی ٹھان رکھی ہے اس کے متعلق آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں میرا دل تو یہ کہتا تھا کہ جب آپ یہ دیکھیں گے کہ اس گھر میں ایک فساد برپا ہو گیا ہے تو میں آپ کو عقل کی بات مان لینے پر آمادہ کر ہی لونگی۔ یہ میں جانتی ہوں کہ آپ کو اس کا یقین ہے کہ مجھ سے بیاہ ہونے کے بعد گویا آپ کو ایک معقول دان دہیز اور روپیہ والی دلہن ملجائے گی روپیہ پیسہ پر عام لوگوں کی تو بہت رال ٹپکتی ہے لیکن سچے فلاسفر کی نظر میں دھن دولت بے قدری چیز ہے اور خالی خولی نمود اور روپیہ کی بڑائی آپ جو کرتے رہتے ہیں وہ محض باتیں تو

ہو نہیں سکتیں اور نہ ہونی چاہیئے۔

تمر۔ اور آپ نے جو میرا دل اپنا کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ آپ کا شاندار حسن موہنی اور دل کے پار ہوتے والی نگاہیں آپ کی دلکش سج دھج آپ کی دل ربا چال ڈھال یہ انمول چیزیں آپ کا دان دہیز آپ کا دھن ہیں اور میرا دل جو آپ کی جانب کھنچا ہے اور مجھ میں جو آپ کی طرف محبت کا نفیس احساس پیدا ہوا ہے اس کی وجہ یہی پائی ہیں۔ اس دھن دولت اور محض اسی پر میں دل اور جان سے فدا ہوں۔

آل۔ آپ کی اس بے لاگ اور فیاضانہ دل لگی کی میں دل سے شکر گذار ہوں۔ اس خالص محض میری ذات کی محبت کے بوجھ کے نیچے میں دبی جاتی ہوں اور افسوس کے ساتھ مجھ کو کہنا پڑتا ہے کہ مجھے آپ سے جواب میں اسی طرح اُلفت مطلق نہیں ہیں آپ کی عزت کرتی ہوں جہاں تک ایک انسان دوسرے کی کر سکتا ہے مگر میں آپ کو دل نہیں دے سکتی اس لئے کہ اس راستے میں ایک رکاوٹ حائل ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دل دو کا تو ہو نہیں سکتا اور مجھے یقین ہے کہ کلتا ندر نے میرے دل کو بالکل اپنا کر لیا ہے۔ میں یہ مانے لیتی ہوں کہ اس میں آپ کی سی قابلیت نہیں اور میں نے جو انتخاب کیا ہے اس سے شاید کچھ اس کا پتہ چلتا ہے کہ میرا مذاق کچھ بھونڈا سا ہے یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ آپ میں سینکڑوں قسم کی قابلیت ہے اور ان کو دیکھا جائے تو مجھے آپ کو ہی ترجیح دینی چاہیئے تھی میں خوب سمجھتی ہوں کہ میں غلطی پر ہوں لیکن دل کے معاملہ میں زور نہیں چل سکتا۔ عقل بس اتنا کر سکتی ہے کہ میں اپنے اندھے پن پر اپنے آپ کو ملامت کرتی رہوں۔

نثر ۔ جب تم جیسی نعمت میرے ہاتھ لگ جائے اور مجھے اس کی امید بھی دلائی گئی ہے تو پھر ایک دفعہ میری ہونے کے بعد جو دل کہ اس وقت کلتا ندر کے ہاتھ میں ہے اپنے آپ اس کے ہاتھ سے نکل آئے گا۔ اور میں اس توقع کے ظاہر کرنے کی جسارت بھی کرتا ہوں کہ ہزار ہا طرح کی ناز برداریوں سے آپ کے دل کو اپنا کر لینے کی فکر کر دوں گا۔ اور کیا عجب کہ ایک دن وہ گر بھی میرے ہاتھ لگ جائے جس سے میں آپ کے دل میں گھر کر لوں۔

آن ۔ نہیں اس سے خاطر جمع رکھئے۔ میرے دل کا یہ پہلا رجحان ہے اور اس کا رُخ بدلنا کسی طرح کی ناز برداریوں کے بس کی بات نہیں۔ میں بے خطر ہو کر اس معاملہ میں آپ کے سامنے اب دل کھول کے رکھے دیتی ہوں۔ اور اس صاف گوئی میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے آپ کا دل دکھے اور آپ ناراض ہوں یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ صنفی کشش دلوں میں جو آگ لگاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ کسی میں دماغی یا اخلاقی جوہر بہت ہیں۔ اس میں کچھ سنک کو بھی دخل ہے اور اکثر تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان ایک پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس سے وجہ پوچھی جائے تو کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر جناب من یہ بات ہو سکتی کہ انسان کے دل میں کسی کے حکم یا عقل کے فرمان سے محبت پیدا ہو جائے تو یقین مانیئے کہ میرا دل آپ کا ہوتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ سب دل پر کسی کا قابو نہیں۔ میری التجا ہے کہ مجھے اندھا کا اندھا ہی رہنے دیجئے اور یہ احساسات پر جو ظلم دستم توڑنے کی تجویز ہے اس سے کنارہ کیجئے اس سے نفع اٹھانے کا خیال دل میں نہ لائے۔ عزت دار آدمی ماں باپ کے اختیار اور اقتدار سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ایسے لوگ اپنی دلربا کی اس طرح کی قربانی کے خیال سے ہی تھرا اٹھتے ہیں اور اس ہستی کو اپنا بناتے ہیں جس کے دل پر انھوں نے فتح پائی ہو۔

میری اماں جان کو اس بات پر نہ ابھاریئے کہ وہ اپنے ماں کے اقتدار کو کام میں لائیں اور مجھے مرضی کے مطابق بیاہ کرنے پر مجبور کریں آپ اپنے پیام کو واپس لے لیجئے اور اپنے انمول دل کو کسی اور جگہ پیش کیجئے۔

تر۔ میں کس طرح آپ کی اس استدعاء کو پورا کر سکتا ہوں مجھے ایسی بات کا حکم دیجئے جو میری طاقت سے باہر نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ میں آپ کو نہ چاہوں۔ ہاں یہ اسی وقت ہوسکتا ہے آپ چاہنے کے قابل نہ رہیں آپ کی دیوتائی دلفریبیاں اس طرح روشن۔

آن۔ یہ بنانے کی باتیں رہنے دیجئے۔ آپ نے اپنے کلام میں بیسوں ہی عورتوں ای ریس فلیس اور امانت کے سراپا کھینچے ہیں اور ان سبھوں سے یکساں دیوانہ وار عشق کی قسمیں کھائی ہیں۔

تر۔ اُن سے میرے دماغ نے خطاب کیا ہے میرے دل نے نہیں۔ ان سے مجھے محض شاعر کی حیثیت سے عشق ہے لیکن پرستش کے قابل آنریت کو میں تہ دل سے چاہتا ہوں۔

آن۔ او ہو بس جناب بس میں آپ سے استدعا کرتی ہوں۔

تر۔ تو یہ میری باتیں تو کسی طرح دور نہیں ہو سکتیں اس دل سے آپ نے اب تک بے التفاتی برتی ہے لیکن اس نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ سدا آپ کا ہی رہے گا۔ اس دل کو آپ کی محبت کے مزے لینے سے کون روک سکتا ہے اگر آپ اس دل سے رکھائی اور بے رخی پر تلی ہی ہوئی ہیں تو پھر آپ ہی کہیئے کہ میں آپ کی والدہ صاحبہ سے امداد کیوں نہ لوں۔ وہ اس پر حسرت دستاویز پر جو میرے لئے اس قدر قیمتی ہے یہ ثبت کرنے کو آمادہ ہیں۔ بشرطیکہ مجھے یہ انمول مسرت ملجائیگی بشرطیکہ آپ میری ہو جائیں مجھے اس سے پروا نہیں کہ

کن ذرایع سے مجھے یہ گوہر مقصود ہاتھ آئیگا۔

آن۔ لیکن زبردستی ایک کام پر مجبور کرنے سے جو خطرہ پیدا ہوتا ہے کیا آپ اسے محسوس نہیں کرتے؟ صاف بات تو یہ ہے کہ کسی لڑکی سے مرضی کے خلاف بیاہ کرنا ذرا خطرے کی ہی بات ہے کیونکہ جب زبردستی کی بیڑی اس کے پاؤں کو زخمی کر دے تو بہت ممکن ہے کہ وہ انتقام کے ایسے ہتھیار سے کام لے کہ شوہر بیچارہ ہکا بکا رہ جائے۔

تھر۔ ایسی باتیں میں نے بہت سی سنی ہیں مجھ پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ عقلمند ہر طرح باتوں کی پیش بندی کر لیتا ہے عام طور پر جو لوگوں میں کمزوریاں ہوتی ہیں اُن کو عقل کے سہل سے صاف کر لیتا ہے وہ ایسی باتوں سے بالاتر ہوتا ہے ان چیزوں سے جو اس کے قابو سے باہر ہیں الجھن پیدا ہوتی ہے اس کی پرچھائیں بھی اس تک نہیں پہونچ سکتی۔

آن۔ واقعی میں آپ کی اس بات سے بہت ہی خوش ہوئی مجھے یہ خبر نہ تھی کہ فلاسفی میں ایسی خوبیاں بھی ہیں کہ انسان کو اس قسم کے حادثے بھی ٹھنڈے دل اور مضبوطی سے برداشت کرنے سکھاتی ہے۔ یہ آپ کے دل کی مضبوطی جو خاص آپ میں پائی جاتی ہے اس کی سزاوار ہے کہ آپ کو کوئی ایسی شاندار ہستی ملے جس کے بارے میں آپ اس خصوصیت سے بخوبی کام لے سکیں۔ اور جو اس دل کی مضبوطی کو کسوٹی پر کسنے کی اُن تھک کوشش کیا کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کی شہرت میں اس پہلو سے اضافہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ مناسب یہی ہوگا کہ یہ کام کوئی اور ہی اپنے ذمہ لے میں اس بات کے کہنے کی جسارت کرتی ہوں کہ میں آپ کی دلہن بننے کی مسرت سے باز آتی ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ تمہاری بیوی نہیں ہونگی۔

تر۔ یہ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ رجسٹرار بھی پہونچ ہی گئے ہیں۔

سین دوسرا

کلتاندر۔ مارتین۔ آنریت

کری۔ خوب آئیں، بیٹھئے۔ میں اس وقت تمہیں دیکھکر باغ باغ ہوگیا۔ آؤ یہاں آؤ اپنی سعادت مندی دکھاؤ اور اپنے باپ کے کہنے کے مطابق چلو۔ میں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ تمہاری اماں کو پوری طرح یہ سبق دو دن کہ بیوی کو اپنے آپ کو نہ بھولنا چاہیئے اس کی بسم اللہ یوں کی ہے کہ مارتین کو بیم صاحب کی ضد پر بلوا لیا ہے وہ دیکھو موجود ہے اور وہ پھر گھر میں پہلے کی طرح کام دھام کرے گی۔

آن۔ آپ کے ارادے تعریف کے لایق ہیں مگر ابّا خبردار رہنا یہہ جوش ٹھنڈا نہ پڑنے پائے دل کڑا کرکے وہی کیجیئے جس کی ٹھان لی ہے اور کوئی آپ کی نیک طبیعت کو ڈانواں ڈول نہ کرنے پائے۔ پیچھے ہٹئے بھی نہیں اور پورا زور لگائیے کہ آپ پر اماں کا داؤ چلنے ہی نہیں وہ نیچا نہ دکھا سکیں۔

کری۔ ہائیں۔ کیا تم نے مجھے سادہ لوح سمجھ رکھا ہے؟

آن۔ خدانخواستہ۔

کری۔ اچھا تو کیا میں گدھا ہوں؟

آن۔ یہ میں نے کب کہا۔
کری۔ کیا تم سمجھتی ہو ایک صاحب عقل کی طرح میں اپنی بات کا پکا نہیں ہوں۔
آن۔ نہیں ابّا آپ یہ کیا کہتے ہیں۔
کری۔ کیا اس سن میں میں اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ اپنے ہی گھر میں اپنے آپ کو منوا سکوں۔
آن۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔
کری۔ یا اب میں ایسا دل کا کچا ہو گیا ہوں کہ بیوی کے ہاتھ میں موم کی ناک بنجاؤں؟
آن۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔
کری۔ تو تمہارا مطلب کیا تھا؟ تم مجھ سے باتیں کر کے میرا مذاق اڑانا چاہتی ہو۔
آن۔ کوئی بات آپ کو ناگوار ہوئی ہے تو یقین مانئے میں نے جا کر یہ بات نہیں کہی۔
کری۔ اس گھر میں صرف میری ہی بات مانی جائے گی۔
آن۔ بیشک ابا یہی ہونا چاہیئے۔
کری۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ میرے سوا یہاں کوئی حکم چلا سکے۔
آن۔ ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔
کری۔ اس گھر کا بڑا میں ہوں۔
آن۔ یقیناً۔
کری۔ اپنی بیٹی کی شادی بیاہ کا اختیار مجھکو ہے۔

آن۔ ہاں ہاں آپ کو ہے۔
کری۔ تم پر مجھے خدائے تعالیٰ نے پورا اقتدار عطا کیا ہے۔
آن۔ تو اس سے انکار ہی کس کو ہو سکتا ہے۔
کری۔ اور میں اب تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ بیاہ کرنا ہے تو تمہیں میرا حکم ماننا چاہیئے نہ کہ اپنی اماں کا۔
آن۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ یہی تو میری عین آرزو ہے کہ آپ مجھے اپنا حکم ماننے پر مجبور کر دیں۔
کری۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ میری بیوی کو مرضی کے خلاف کرنے کی جرٲت ہو سکتی ہے۔
کل۔ لیجیئے وہ بھی آ ہی گئیں اور رجسٹرار کو اپنے ساتھ ہی سے لئے آتی ہیں۔
کری۔ دیکھو اب تم سب میرا ساتھ دینا۔
مار۔ یہ کام میرا ہے اگر ضرورت ہوئی تو میں تمہارا دل بڑھاتی جاؤنگی

سین تیسرا

فلامنت۔ بلیس۔ ارماند۔ ترسوتین۔ رجسٹرار
کریسال۔ کلتاندر۔ آنریت۔ مارتین۔

فلا۔ کیا تم اپنی بربری طرز تحریر کو نہیں بدل سکتے اور حسین الفاظ میں کابین نامہ نہیں لکھ سکتے۔

رجسٹرار۔ ہمارا اسلوب نہایت تحفہ ہے۔ اگر میں ایک لفظ کی بھی ردوبدل
کردوں میم صاحب یقین مانئے کہ میں بڑا ہی کوڑھمغز ہوں۔

بل۔ یا اللہ عین فرانس کی زبان میں اور یہ بربریت۔ لیکن موسو علم
و فضل کا اتنا تو احترام کیجئے کہ کم سے کم زردہر کو بجائے فرانسیسی سکون کے
رومی سکون میں لکھیئے۔ اور تاریخیں یونانی تحریر کیجئے۔

رجسٹرار۔ خوب مجھ سے یہ بھی نہیں ہوگا اگر میں آپ کے کہنے سے
ایسا کر بیٹھوں تو سارے میرے ساتھ کے وکیل مجھے لولو بنا دینگے۔

فلا۔ نہیں اس بربریت کے آگے ہماری پیش جائیگی۔ اچھا موسو بیٹھے
اور جو کہیں لکھ ڈالیئے۔ اہو ہو۔ اس ڈھیٹ گنوریا کا یہ دیدا کہ پھر مجھے اپنی صورت
دکھلائے! میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ اس کو گھر میں پھر کیوں گھسایا؟

کری۔ ذرا ایک کام سے فراغت ملجائے تو میں اس کی وجہ بتلاؤنگا
اب اس وقت دوسرا کام تو پہلے نبٹ جائے۔

رجسٹرار۔ بہتر ہوگا کہ کابین نامہ لکھ لکھا جائے۔ دلہن کہاں ہے۔

فلا۔ میری سب سے چھوٹی لڑکی بیاہی جائیگی۔

رجسٹرار۔ خوب۔

کری۔ ہاں دیکھئے وہ کھڑی ہے اس کا نام آنریت ہے۔

رجسٹرار۔ بہت خوب۔ اور دولہا کہاں ہے؟

فلا۔ یہ صاحب دولہا ہیں۔

کری۔ اور یہ صاحب وہ ہیں جن کو میں اپنی لڑکی دینی چاہتا ہوں۔

رجسٹرار۔ دو شوہر! ایک ضرورت سے زیادہ ہے۔

فلا۔ ہائیں آپ لکھتے کیوں نہیں؟ لکھئے ترسوتین میرا داماد ہے۔

کری۔ کلتا ندر کا نام لکھئے اس کو میں اپنی فرزندی میں لیتا ہوں۔
رجسٹرار۔ پہلے آپ لوگ آپس میں ایک بات طئے کر کے پختہ فیصلہ کر لیجئے کہ کن صاحب کو دولہا بنایا جائیگا۔
فلا۔ میں جو کہہ رہی ہوں آپ اس کے مطابق لکھئے۔
کری۔ آپ وہی کیجئے جو میرا منشا ہے۔
رجسٹرار۔ مجھے یہ بتائیے کہ آپ دونوں میں سے کس کس کی بات کو مانوں۔
فلا۔ اچھا۔ تم میری مرضی کے خلاف کرنا چاہتے ہو۔
کری۔ میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیسکتا کہ لوگ میری لڑکی کے پیچھے محض ہماری گھر کی دولت مرات کی غرض سے پڑیں۔
فلا۔ آخر میرے منہ سے کہواؤ گے ہی کہ تمہارے ہاں ایسے کونسے لعل جواہر ہیں کہ لوگ تمہاری دولت کا خیال بھی کریں۔ دانشمند آدمی کبھی ان پست باتوں کا اندیشہ ہی نہیں کرتا۔
کری۔ بہرحال۔ میں نے اس کے لئے کلتا ندر کو چنا ہے۔
فلا۔ اور میں نے ان صاحب کا انتخاب کیا ہے میں نے ٹھان لی ہے اور میرا ہی کہنا ہو کر رہیگا۔
کری۔ واقعی۔ تم اپنی حد سے باہر ہوئی جاتی ہو۔
مار۔ بیوی کا کام حکم چلانا نہیں ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہر معاملہ میں بیوی کو میاں کے آگے دب جانا چاہیئے۔
کری۔ ٹھیک کہا۔
مار۔ مجھے چاہیئے ایک دفعہ نہیں سو دفعہ جواب دیا جائے میں تو

یہی کہوں گی کہ مرغے کی ہوت میں مرغی کو بانگ نہیں دینی چاہیئے۔

کری۔ بالکل درست۔

مار۔ سب ہی جانتے ہیں کہ جب کسی کی بیوی موچھیں لگا کر میاں بنجاتی ہے تو لوگ ایسے آدمی کی بڑی ہی بہار اڑاتے ہیں۔

کری۔ یہ سچ ہے۔

مار۔ اگر میرا میاں ہوتا تو سچ مانیئے میں تو اسے اپنے گھر کا آقا ہی سمجھتی وہ اگر جونق ساتھی ہوتا تو میں اس بات کا ذرا بھی خیال نہ کرتی۔ کبھی میں اس کے ہہنہ آتی یا کسی بات میں اس کو ہہنہ کی کہلاتی یا بہت زیادہ زبان چلاتی تو میں اس سے یہی آشا کرتی کہ ذرا اچھی طرح میری چمڑی کو اتو کر دے اور پیٹھ کی کھجلی مٹا دے۔

کری۔ کیا سمجھ کی بات کہی ہے۔

مار۔ ہمارے سرکار کا کہنا ٹھیک ہے کہ اپنی لڑکی کے لئے دولہا وہ اپنی مرضی کا ڈھونڈیں۔

کری۔ اور نہیں تو کیا۔

مار۔ کلتا ندر کو کیوں پھیرا جائے۔ وہ جان جوان ہے اور قبول صورت۔ اور کیوں اس بیچاری بچی کو ایک فاضل پور ہینے کے پلے باندھا جائے جو ہمیشہ شعروں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ بچی کو دولہا کی ضرورت ہے استاد جی کی حاجت نہیں وہ یونانی یا لاطین پڑھنا نہیں چاہتی تو پھر موسو تر سوتین کی کیا مار پڑی ہے۔

کری۔ بہت خوب۔

فلا۔ اس کی ٹر ٹر پوری ہو لینے دو۔

مار۔ پڑھے لکھے کس مرض کی دوا ہوتے ہیں بس آرام کرسی پر لیٹے لیٹے باتیں بگھارتے ہیں۔ قاعدے بناتے ہیں۔ میں لاکھ دفعہ ڈنکے کی چوٹ کہوں کہ مجھے عالم فاضل میاں نہیں چاہیئے۔ گھرداری میں علم وِلم کچھ کام نہیں دیتا۔ پستک اور بیوی میں کچھ سوکناپا سا ہوتا ہے۔ ہیں۔ کسی کے گھر پڑی تو میں ایسا ہی میاں پسند کروں گی جو میرے سے مجھکو ہی اپنی کتاب سمجھے جو الف جانے نہ بہالا۔ میم صاحب آپ ناراض نہوں یہ تو ایک بات کہہ رہی ہوں ہاں باتوں کی ایک بات میرے میاں کو جو کچھ علم ہو اپنی بیوی کا علم ہو۔

فلا۔ کیا اس کی بکواس ہوچکی؟ میں نے تمہارے ترجمان کو بڑے ہی صبر سے سنا۔

کرہی۔ اس نے جو کچھ کہا سچ کہا۔

فلا۔ اچھا اب جھگڑے کو ہی طے کئے دیتی ہوں۔ میں اصرار کرتی ہون پورے زور کے ساتھ کہ میں جو چاہتی ہوں وہی ہوگا۔ آنریت اور ترسوتین کا ابھی عقد ہوگا۔ میں کہہ چکی اور یہی میرا انشا ہے اب اس بارے میں میں ایک نہیں سنونگی۔ اگر کلتا ندر کو زبان دے چکے ہو تو اس کے ساتھ اپنی بڑی لڑکی کو اگر وہ چاہے تو بیاہ دو۔

کرہی۔ ہاں یہ ایک صورت معاملہ کے طے ہونے کی نکل آئی۔ لو کیا تم اس پر راضی ہو۔

آن۔ ہائیں۔ ابّا۔

کل۔ ہائیں۔ موسو۔

بل۔ ہم بھی ایسی تجویزیں ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جو اس سے

بھی بہتر ہوں لیکن ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ محبت کا ایسا نمونہ قایم کریں جو صبح کے ستارہ کی طرح پاک اور ستھرا ہو جس میں روح پوری طرح حصہ لے لیکن جس میں سے ابعاد ثلاثہ کی کھینچ تان میں مبتلا مادہ کو دخل نہ ہو۔

آخری سین

اریست۔ کریسال ۔ فلامنت ۔ بلیس
آنزیت ۔ ارمانڈ ۔ ترسوتین ۔ رجسٹرار
کلتاندر ۔ مارتین

اریست۔ میں اس خوشی کے موقع پر افسوس ہے کہ بری خبریں لایا ہوں مجھے اس کا بڑا ملال ہے کہ یہ دو خط اس وقت مجھے لانے پڑے اس لئے کہ ان دونوں میں بری خبریں ہیں۔ ایک تو بھائی تمہارے مختار کا خط ہے اور دوسرا بھائی تمہارا ہے اور لیوس سے آیا ہے۔

فلا۔ ایسی کیا آفت آئی ہے کہ کسی کو ہمیں خط لکھنے کی ضرورت لاحق ہو؟

اریست۔ اس خط میں آپ خود ہی پڑھ لیجئے یہ خبر ہے۔

فلا۔ (پڑھتی ہے) بیگم صاحبہ میں نے تمہارے دیور کو لکھا ہے کہ اس خط کو آپ تک پہونچا دیں اور اس خط سے وہ باتیں آپ کو معلوم ہوں گی جن کو زبانی آپ تک پہونچانے کی مجھے جرات نہیں ہوئی۔ معاملات میں آپ کی زبردست لاپرواہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہارے وکیل کے منشی نے غفلت برتی

اور وقت پر ضروری معلومات نہیں بھیجیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار آپ کا مقدمہ ہر گیا۔ حالانکہ اس مقدمہ میں جیت آپ کو ہونی چاہیئے تھی۔

کری۔ تمہارا مقدمہ ہر گیا۔

فلا۔ تم تو بدحواس سے ہو گئے دیکھو مجھ پر اس صدمہ کا کچھ اثر ہوا۔ میرے استقلال میں بال برابر فرق آیا۔ مہربانی کرکے اتنی بے ہمتی کا اظہار نہ کیجئے ذرا تو تقدیر کے کرشموں کا میری طرح مردانگی سے مقابلہ کیجئے۔ (پڑھتی ہے) تمہاری بے پرواہی کا خمیازہ چالیس ہزار کرول تم کو بھگتنا پڑے گا۔ اور تم کو عدالت نے مجرم قرار دیکر اس رقم کو معہ خرچہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ مجرم قرار دے کر کس قدر بھونڈا اور صدمہ دینے والا لفظ ہے یہ تو صرف مجرموں کے لئے موزوں ہے۔

ارلیستا۔ یہاں یہ لفظ غلط استعمال ہوا ہے۔ آپ کا اعتراض درست ہے۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ عدالت کے فیصلہ کی بنا پر ان کی درخواست ہے کہ اتنی رقم معہ خرچہ ادا کر دی جائے۔

فلا۔ اچھا اب دوسرے خط کو دیکھیں۔

کری۔ (پڑھتا ہے) جناب من مجھے آپ کے بھائی صاحب سے محبت ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ میں ان باتوں کا خیال رکھوں جو ان سے متعلق مجھ تک پہونچ سکیں مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی ساری پونجی ارگانت اور داموں کے کاروبار میں لگا رکھی ہے اور مجھے یہ خبر دینی ہے کہ دونوں کے دونوں نے ایک ساتھ دوالا نکالدیا ہے۔

یا اللہ یوں ساری میری پونجی ایک ہی دفعہ ڈوب جائیگی۔

فلا۔ یہ سر پیٹنا کس قدر شرم ناک ہے۔ ذرا تو ہوش میں آؤ۔ یہ میں ہی

کونسی بڑی باتیں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ سچے فلاسفر کے لئے تقدیر کے ایسے سخت وار ہی تو اکسیر ہیں۔ ساری دنیا کا نقصان ہو جائے وہ خود تو باقی ہی رہتا ہے۔ لو آؤ اس معاملہ کو طے کر دیں۔ صدمہ الگ رکھیئے ترسوتین کی دولت اس کے اور ہم بہنوں کے لئے بہت کافی ہوگی۔

تر۔ نہیں بیم صاحب اب اس معاملہ میں اصرار نہ کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سب اِس بیاہ کے خلاف ہیں اور میں کسی پر جبر و زیادتی رَوا نہیں رکھتا۔

فلا۔ یہ خیال اب آپ کے دل میں اچانک ہی پیدا ہو گیا۔ یہ یاد رہے سو سو کہ ہماری بربادی کی خبروں کے بعد ہی اس کا ظہور ہوا ہے۔

تر۔ آخر اِس مخالفت سے میرا ناک میں دم آ گیا ہے میں اس بات سے ہاتھ اٹھا لینا ہی بہتر سمجھتا ہوں میں ایسے دِل پہ قبضہ کرنا نہیں چاہتا جو خوشی سے اپنے آپ کو میرے حوالہ نہ کرے۔

فلا۔ اب تک میں نے کبھی تمہارے خلاف کسی بات پہ بھروسہ نہیں کیا اَب میری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

تر۔ اب آپ میرے متعلق جو جی چاہے خیال کیجئے مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ میری اس حرکت کو کیا خیال کرتی ہیں۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں شرمناک طور اور توہین کے ساتھ مجھ سے اِنکار کیا جائے اور میں سہے جاؤں میں تو اس لائق تھا کہ میری قدر و قیمت کی جاتی اور میں شکریہ کے ساتھ ایسی لڑکی کے ساتھ بیاہ کرنے سے انکار کرتا ہوں جو میری بیوی بننا نہیں چاہتی۔

فلا۔ اس شخص نے اپنی زر پرست رُوم پر سے بالکل پردہ اُٹھا دیا۔

اس کی حرکت کس قدر فلاسفی سے بعید ہے۔

کل۔ میم صاحب مجھے فلاسفر ہونے کا فخر نہیں ہے لیکن یقین مانئے کہ میں آپ کی اس بپتا میں بھی آپ کا شریک حال ہونے کو موجود ہوں اور میں اپنے آپ کو اور اپنی تھوڑی بہت دولت کو جو خدا نے مجھے اپنی عنایت سے دے رکھی ہے آپ کی خدمت میں ادب کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

فلا۔ خدا تمہیں اچھا رکھے تم نے اس فیاضانہ بات سے میرا دل خوش کر دیا۔ اور میں بھی تمہاری محبت کا صلہ تمہیں دینا چاہتی ہوں۔ ہاں میں آنریت کو اس بہتر اور برتر محبت کے حوالہ۔

آن۔ نہیں اماں اب میں نے اپنا خیال بدل دیا مجھے معاف کیجئے میں آپ کا کہنا نہیں مان سکتی۔

کل۔ ہائیں تم میری خوشی نہیں چاہتیں۔ اب کہ ہر ایک اس بات پر رضامند ہو چکا ہے۔

آن۔ کلت اندر مجھے معلوم ہے کہ تمہاری دولت کچھ زیادہ نہیں ہے مجھے اس دن کی بڑی آرزو تھی کہ میں تمہاری بیوی بنوں اور ایک طرف میری محبت پروان چڑھے اور دوسری طرف تمہاری مالی حالت بہتر ہو جائے لیکن اب حالات دگرگوں ہو گئے ہیں۔ مجھے تم سے اس قدر محبت ہے کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ اپنی مصیبت کا بوجھ تم پر لادوں۔

کل۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارے ہوتے مجھے ہر حال میں خوشی ہے۔ تمہارے بغیر مجھے اپنی زیست وبال ہو جائیگی۔

آن۔ محبت جوش میں اس قسم کی باتیں کہلواتی ہے محبت کی ڈور ان روزمرہ ضرورتوں کی الجھنوں سے یقیناً گھستے گھستے کٹ جاتی ہے۔

اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی چند خوشی کے گھڑیوں کے بعد ساری مصیبتوں
کا الزام ایک دوسرے کے سر دھرنے لگتے ہیں۔

اریست۔ ابھی جو بری خبریں بہن نے پہونچائی ہیں کیا اُن کی
ہی وجہ سے تم اب کلتا ندر کے ساتھ بیاہ کرنے سے پس و پیش
کر رہی ہو۔

آن۔ اگر یہ بات نہ ہوئی تو میں خوشی کے مارے اُچھل پڑتی میں
اب اِس لئے انکار کرتی ہوں کہ مجھے اس سے خالص محبت ہے۔

اریست محض یہ بات ہے تو خوشی سے بیاہ کی دلفریب بیڑیاں
پہن لو۔ یہ خبریں جو میں لایا تھا جھوٹی ہیں۔ یہ ایک چال تھی۔ ایک ترکیب
تھی جو مجھے سوجھی جس سے ایک طرف تمہارا کام بھی بنتا اور دوسری طرف بھائی
کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ بہن کے فلاسفر صاحب آزمائش میں کہاں تک
پورے اترتے ہیں اور وہ ہیں کتنے پانی میں۔

کریسی۔ یا اللہ تیرا ہزار ہزار شکر۔

فلا۔ مجھے اس خیال سے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ اب یہ بات
معلوم ہو گی تو یہ چھوٹا مکار کس قدر دل میں کٹ کٹ جائے گا۔ اس کے
کمینہ پن اور لالچ کی یہی سزا ہے کہ اسے دکھایا جائے کہ شادی کس دھوم
دھام سے منائی جارہی ہے۔

کریسی۔ مجھے یقین تھا کہ تم کلتا ندر کو ہی بیٹی دوگی۔

ار۔ تو اُن کی خوشی کے پیچھے میری خوشی قربان کی جارہی ہے۔

فلا۔ بھلا تم کسی پر کب قربان کی جا سکتی ہو۔ تمہارے دلاسے
کے لئے فلاسفی موجود ہے۔ اور تم ان کی محبت کی کامیابی کو صبر و شکر

کے ساتھ دیکھ سکتی ہو۔

بل۔ کلتا ندر خبردار رہے کہ مجھے اب بھی اس سے الفت ہے۔ مایوسی کے صدمہ سے بعض اوقات لوگ بیاہ کر لیتے ہیں اور پھر عمر بھر پچھتاتے رہتے ہیں۔

کری۔ رجسٹرار صاحب آئیے میری ہدایت کے بموجب کابین نامہ تیار کیجئے۔

گڑیا خانہ

مولانا ماجد نے اس مضمون کو پڑھکر فرمایا تھا کہ " اس مضمون میں فلسفہ کو جس طرح پانی کیا گیا ہے وہ میرے لیے قابلِ رشک ہے"۔
واقعہ یہ ہے کہ مضمون نگار نے جس طرح فلسفیانہ اور نفسیاتی رموز ونکات کو روزمرہ اور دلی کی سیدھی سادی زبان میں حل کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

یہ ایک بے نظیر فلسفیانہ مضمون ہے جو گڑیاں کے کھیل سے آغاز کر کے انسان کی ذہنی جد وجہد کی دماغی گڑیوں کے کھیل تک پہونچتا ہے جہاں انسان زندگی کے اعلیٰ منصوبے باندھتا ہے اور اس کا دماغ حیرت ناک گڑیا خانہ بنجاتا ہے۔ کہیں روحانی گڑیاں سجی ہیں تو کہیں سماجی۔ کہیں سیاسی تو کہیں اقتصادی۔ ایک طرف ادبیات والی گڑیاں ہیں تو دوسری طرف سائینس وحکمت کے جھمکے۔ پھر یہ مضمون بلند پروازی کر کے ارتقاء کی ہمہ گیر گڑیا پر احاطہ کرتا ہوا کائنات کے مالک کی اپنی مخلوق کی گڑیوں کے کھیل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

The most liked and most read Drama of the book is of Molana's Dramatization

آپ مضمون کے نام پر نہ جائیے۔ اپنے بعض مضمونوں کے اس قسم کے نام تو مرحوم نے جان بوجھکر اسلئے رکھے تھے کہ یہ شوقینوں کے لئے گوندے کا کام دیں۔ اگر مضمونوں کے نام فلسفیانہ یا معاشیات وعمرانیات، وغیرہ سے تعلق رکھنے والے رکھے جاتے تو کون اُن کے پڑھنے پر آمادہ ہوتا؟ عنوان پڑھکر ہی اُلجھن ہوتی اور بن پڑھے چھوڑ دیئے جاتے۔ جس طرح آپ کو تو معلوم ہی ہے، بہت سے علمی رسالوں کے مضامین تشنۂ مطالعہ رہجاتے ہیں۔

اس مضمون میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے لڑکے اور لڑکیوں کی make belief instinct سے بحث کرتے ہوئے Complexes کا ذکر چھیڑا ہے اور اس کے بعد فرئیڈ کے تجزیۂ نفس (Psycho-analysis) کی بال کی کھال کھینچتے ہوئے الہیات پر جا پہونچے ہیں لیکن آپ فلسفہ یا اُن کی اصطلاحات سے پریشان نہ ہوں۔ فاضل مضمون نگار نے اپنی مخصوص اِنشاء پردازی سے اس کو اتنا آسان۔ عام فہم اور سلیس بنا دیا ہے کہ پڑھنے میں ذرا اُلجھن یا رکاوٹ نہیں ہوتی۔ آپ بے تکان پڑھتے جائیے ایک دلچسپ قصہ کی طرح تمام مطالب خود بخود واضح اور ذہن نشین ہوتے جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑا مسئلہ سیدھی سادی اور چٹپٹی زبان میں لکھکر حکمت اور فلسفہ کو پانی کر دیا ہے اور ساتھ ہی ظرافت کے پہلو کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

ننھی نے ایک الماری میں گڑیاں بنھا رکھی تھیں۔ روز صبح شام اور

دوپہر الماری کھلتی تھی اور گڑیاں کھیلی جاتی تھیں۔ کلّو اور سانولی کو ساتھ بٹھالیا۔ ایک گڑیا کو لیا۔ اس کا روپٹہ اتارا۔ انگیا ٹھیک کی پاجامہ کا نیفہ درست کیا اور پھر بڑی احتیاط سے روپٹہ اڑھایا اور باتیں ہوتی گئیں:۔

" اری کلّو! دیکھ تو سہی! اس نے رات بھر میں روپٹہ کا کیا ستیاناس کیا ہے۔ یہ موئی گڑیا دیوانی ہے اور یہ تو دیکھ انگیا کا کیا حال ہے ساری چڑیاں ڈال دیں۔ بڑی ہی پھوہڑ ہے میں نے کیسی انگیا سی تھی۔ یہ ایسی ہی پھوہڑیا رہی تو میں اس کا بیاہ ویاہ نہیں کروں گی "

کلّو بولیں " اے ہے! ننھی بیوی۔ اس کی صورت تو بڑی پیاری پیاری بھولی بھالی سی ہے۔ اچھی بیوی! اس کا بیاہ کر دو۔ ہم ہنڈکلیا پکائیں گے۔ بھورا اور کلّو باجا بجائیں گے "

" اری ہاں۔ بڑا تماشہ ہوگا۔ اماں سے دو آنہ کے پیسے لونگی۔ بریانی تنجن اور . . . . "

سانولی نے لقمہ دیا " کواب، پراٹھے، سموسے . . . . . . "

کلّو چیخنے لگی " بیوی! کھیر، زردہ . . . . "

ننھی کو یاد آیا " ارے ہاں ہاں۔ مزعفر، نان پاؤ کے ٹکڑے اور بھی . . . . "

سانولی ٹپکیں " اور بیوی گھجر بھتہ . . . . "

کلّو اُٹھیں " چل دیوانی کوئی شادی بیاہ میں گھجر بھتہ بھی پکوا تا ہے۔ اتنی بھی خبر نہیں چلی ہیں گڑیاں کھیلنے "

سانولی نے تیوری چڑھا ناک پر انگلی رکھ جواب دیا۔

" بڑی آئی ہیں یہ جاننے والی۔ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل "

کلّو لال پیلی ہو کر بولیں۔

"دیکھئے ننھی بیوی۔ اس سنّو کی باتیں۔ کیا ہم نے اپنی صورت اپنے آپ بنائی ہے جیسی صورت خدا نے بنائی ویسی ہے۔ تم بڑی خبصورت ہو بھینگی بھینگی آنکھوں پر اتراتی ہیں......"

"لو ننھی بیوی! بھلا یہاں آنکھوں کی بھی کوئی بات تھی۔ اب کے آنکھوں کا نام لیا تو ایسا طمانچہ مارا ہو کہ سچ مچ بھینگی ہو جائے۔"

آخر ننھی بیوی بولیں۔

"اری دوانیوں! تم یوں آپس میں لڑو گی تو میں گڑیا کا بیاہ نہیں کروں گی۔ موئی مرغیوں کی طرح کٹم کٹا کرتی رہتی ہیں۔ اری کلّو لے تو یہ دھانی روپٹہ اپنی گڑیا کو اڑھا لے۔ سانولی تو یہ گلابی ساڑی اپنی گڑیا کی بچی کو پہنا دے۔ یہ جیسے شادی کے جوڑے ہیں۔"

آخر ایک دن گڑیا کے دن پھرے۔ بی ننھی کی گڑیا کی شادی ٹھہری منجھلے بھائی میاں گڈے کو بڑے بھائی کے ٹٹو پر بٹھا، برات کے ساتھ لائے۔ چھورے اور کلّو نے ٹین لے کر خوب بجایا بڑے بھائی قاضی بنے ایک سنڈا سا (عمامہ) باندھا اور سوزنی کی چھوٹ موٹ کی مسند پر بیٹھ کر میاں گڈے کا نکاح اس طرح پڑھایا۔

گاجر کی پینڈی گنجیسر و کا پھول
کیوں میاں گڈے یہ تمھیں گڑیا ہے قبول

سارے گھر والے گھیرے ہوئے تھے۔ ہنسیاں ہو رہی تھیں۔ بی ننھی کی سہیلی بی چینی ننھی منی کشتیوں اور رکابیوں میں حصے لگا رہی

تھیں۔ کلّو اور سانولی کھِلی جاتی تھیں اور حصے بانٹ رہی تھیں۔ بی ننھی بھی خوش تھیں۔ ذرا اِس بات پر سمدھن سے دو دو چونچیں ہو رہی تھیں۔

"واہ! بس اپنی گڑیا لے جا لے تھوڑی دوں گی۔ بس بیاہ ہو گیا۔ میری گڑیا میرے پاس رہے گی۔"

سمدھن بولیں: "بوا کلثوم! ذرا ان کی دوان پن کی بات تو سنو دلھن کو سسرال نہیں بھیجیں گی! اِس لڑکی کی عقل تو دیکھو! اچھا تم نہ بھیجو۔ میں بھی برات لوٹا کے لے جاتی ہوں دیکھو! کیسی ناک کٹتی ہے۔"

ننھی منہ پھلا کر بولیں: "ناک کٹے گی تمہاری۔ اتنی اتنی خوشامد کی جب تو میں نے بیاہ کیا۔ بڑی آئی ہیں میری گڑیا لے جانے والی بس بیاہ ہو گیا تم اپنا گڈا لے جاؤ۔ یہ نگوڑا ٹھگنا سا نکٹا۔ بھدا سا مجھے نہیں چاہیئے۔ میری گڑیا کیسی خوبصورت ہے کیسے جھم جھم کے کپڑے ہم نے بنائے ہیں بی مغلانی نے جوڑا سیا۔ یہ آئیں مرے سے بیاہ کر کے لے جانے۔"

"چولھے میں ڈالو اپنی گڑیا کو۔ سوئی ہے کیا! آخر بیٹیوں کی ہے۔ اب ناک بھی رگڑ لو گی تو کبھی تمہارے ساتھ بیاہ دیاہ نہیں کروں گی۔"

"ناک تم نے رگڑی تھی یا ہم نے ...."

"کوئی جھوٹ بولتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے اُس کا منہ نوچ لوں۔"

"تو کوئی دوسرا چپ رہے گا۔ جھوٹی تو آپ ہیں اوروں کو جھوٹا بناتی ہیں۔ جاؤ نکلو۔ میری گڑیا کے کمرے میں سے۔"

"اُبو! ذرا لڑکی کا مزاج تو دیکھو! بڑی آئی ہیں گڑیا والی۔"

"بڑی آئی ہیں سمدھن بن کر میری گڑیا چھیا نے کے لیے۔"

اتنے میں گھر بھر میں خبر پھیل گئی کہ سمدھنوں میں جنگ ہو گئی۔ خوب ہنسیاں ہوئیں سمجھایا بجھایا سمدھنوں کا ملاپ کرایا۔ مگر بی ننھی اسی پر اڑی ہوئی تھیں :-

"دلہنیں سسرال چلی جاتی ہیں پڑی چلی جائیں۔ اُن کا جی چاہتا ہوگا۔ میری گڑیا کا جی نہیں چاہتا۔ میں تو اپنی گڑیا کو نہیں لے جانے دوں گی"

سبھوں نے کہا۔ "بیٹی! یہ تو کھیل ہے۔ پھر تم اپنی گڑیا لے لینا"

"واہ! کھیل کھیل کہہ کر ہماری تو کھیل کی چیز لے جائیں اور ہم یوں ہی رہیں۔ اچھا! یہ ہمیں اپنی چھوٹی گڑیا دے دیں"

"ہاں اچھا تم ہماری چھوٹی گڑیا بیاہ لاؤ"

بی ننھی کا گڑیاں کھیلنا نہایت سبق آموز ہے۔ سب میں بڑی بات گڑیوں کے کھیل میں یہ ہے کہ بی ننھی اور ان کی ساتھ والیاں ایک جھوٹ موٹ کی دنیا اپنے آپ پیدا کر لیتی ہیں گڑیاں ہوتی تو ہیں کپڑے کی لیکن اُن میں بی ننھی جان ڈال لیتی ہیں۔ ننھی کے لئے ہر گڑیا جیتی جاگتی بولتی چالتی ہستی بن جاتی ہے۔ ان گڑیوں کی بھی ایک زندگی ہو جاتی ہے وہی زندگی جو ننھی کی ننھی سی رُوح اُن کے لئے تجویز کر لیتی ہے۔ بی ننھی کی گڑیاں گڑیاں نہیں رہتیں بلکہ سہیلیاں سی ہو جاتی ہیں ویسی ہی جیسی کلّو اور سانولی بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی۔ اس لئے کہ کلّو اور سانولی لاکھ سہیلیاں سہی پھر بھی ایسی ہستی رکھتی ہیں جس پر بی ننھی کو پورا پورا قابو نہیں۔ لیکن گڑیوں کی ہستی پر بی ننھی کو پورا اختیار ہے۔ ان میں صرف وہی باتیں اور اسی حد تک ہو سکتی ہیں جو بی ننھی ان میں اپنے لئے پیدا کرنا چاہیں۔ بی ننھی

اپنی کوئی دل کی بات کلو سے کہیں تو بیس بسوئے وہ کسی سے نہیں کہے گی پھر بھی اس پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ لیکن گڑیا سے یہی بات کہی جائے تو بی ننھی کو اس بات کا پورا بھروسہ ہوگا کہ بات جہاں کی تہاں رہے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ گڑیا ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر سکے۔ کھیل کی دنیا اسی لیئے دلچسپ ہوتی ہے کہ وہ ہماری دنیا ہوتی ہے ہماری پیدا کی ہوئی ہوتی ہے اس پر ہمیں پورا قابو ہوتا ہے اس دنیا میں کوئی بات ہماری مرضی کے خلاف نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے کھیل کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ ایک جھوٹ موٹ کی دنیا اپنے آپ پیدا کر لینا جس کے کل کیل کانٹے اور کل پرزے اپنے اشارے پر کام کریں۔

ننھے میاں ابا جان کی موٹھ والی لکڑی کو ٹانگوں میں لے لیتے ہیں۔ موٹھ ایک ہاتھ میں ہوتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک سنتی جس میں ایک پرانی دہرانی دھجی برائے نام باندھ لی اور کوڑا بنا لیا۔ اس لکڑی کے گھوڑے کو انگنائی، دالان، کمرے اور کوٹھے پر ہر جگہ ننھے میاں کداتے اور بھگاتے پھرتے ہیں۔ اسے جھوٹ موٹ گھاس دانہ کھلاتے ہیں۔ یہ لکڑی کا گھوڑا ننھے میاں کے لئے اسی طرح ایک جیتی جاگتی شے ہے جیسے بی ننھی کے لیے ان کی گڑیاں۔

کھیل کی جان جھوٹ موٹ کی دنیا اپنے آپ مرضی کے مطابق پیدا کر لینا ہے اور کھیل جان کے ساتھ ہے۔ جہاں جان ہوگی وہاں کھیل کا ہونا ضروری ہے۔ اس خواہش کا ہونا کہ اپنے لئے ایسی دنیا بنالی جائے جہاں ہم جو چاہیں سو کریں۔ جہاں ہر چیز ہماری مرضی کے مطابق ہو لڑکیوں کے گڈے گڑیا کا کھیل کھیل کی بہترین مثال ہے اور اس لئے جو دنیا اپنے

آپ پیدا کر لی گئی اور اپنی مرضی کے مطابق آباد کر لی گئی ہو اسے گڈّے گڑیا کا کھیل ۔ اسے گڑیا خانہ کہہ سکتے ہیں ۔ ننھے میاں کا لکڑی والا گھوڑا اور دھجی والا کوڑا اِن معنوں میں اُصولاً گڈّے گڑیا کا ہی کھیل ہے ۔ لڑکے اور لڑکیاں مجبور ہیں کہ کھیل کھیلیں ۔ ایک اپنی مرضی کے مطابق دنیا بنا لیں البتہ سِن کا تقاضا، صنفی امتیازات اور وہ مختلف نفسی رجحانات جن سے آگے چل کر کیرکٹر کی بنیاد پڑتی ہے لڑکیوں اور لڑکوں اور پھر ہر لڑکی اور ہر لڑکے کی کھیل کی دنیا کو ایک دوسرے سے مختلف بنا دیتے ہیں ۔ لیکن لڑکیوں کی گڑیوں والی دنیا اور لڑکوں کا گھوڑے اور کوڑے والا عالم اُصولاً ایک ہیں ۔ دونوں کا کھیل دراصل گڑیاں کھیلنا ہی ہے ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچّوں کی دنیا سے نکلنے کے بعد کیا گڈّے گڑیا کا کھیل ختم ہو جاتا ہے کیا بیاہ بننے کے لائق ہونے اور مسیں بھیگنے کے بعد ہم اپنے گڈّے گڑیا کے کھیل کو بند کر دیتے ہیں اور کیا اپنی گڑیوں سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں ؟

مٹی، چینی اور کپڑے کی ڈھلی ڈھلائی اور سلی سلائی گڑیاں ظاہر ہے کہ ہم عموماً بڑے ہو کر نہیں کھیلتے ۔ موچھوں کا وقار، اور بھری گود والی ماں کی شان اِس قسم کی گڑیاں کھیلنے کی بہت کم اجازت دیتی ہے ۔ اِس میں شک نہیں کہ ایسی چند مثالیں صنفِ نازک میں مل سکیں گی کہ جنھوں نے اپنی بچپن کی گڑیوں کو سینت سینت کر رکھا اور بڑی عمر میں بھی کبھی کبھی اُن کو نکال کر جی خوش کر لیتی ہیں ۔ اسی طرح موچھوں والے طبقے میں بھی ایسی خاصی مثالیں موجود ہیں جو کنکوّے کے موسم میں اپنی لڑکپن والی چرخی نکال لاتے ہیں اور ایک آدھ پینچ لڑا لیتے ہیں ۔ لیکن عموماً یہی ہوتا ہے کہ جب لوگ

بلحاظ سن ماں باپ بننے کے اہل ہو جاتے ہیں تو بچپن کے کھیلوں، کھلونوں اور کھیل کی چیزوں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں اس لئے کہ ان چیزوں میں اب دل نہیں لگتا۔ اب وہ ان کھیلوں میں اپنی دلچسپی کی دنیا نہیں پیدا کر سکتے۔ دماغ ارتقا پا جاتا ہے اور نئی گڑیوں کا متلاشی ہوتا ہے وہ گڑیاں اب بھی کھیلتے ہیں لیکن یہ گڑیاں بیشتر ذہنی ہوتی ہیں اور دماغ کی کسی کوٹھری میں بٹھائی جاتی ہیں۔ یہ نفسی گڑیاں مل جل کر بھی کھیلی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو دل کھول کر صرف عالم تنہائی میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ گڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک دفعہ جان چلی جائے لیکن گڑیا والا یہ گوارا نہ کرے گا کہ ان پر کسی اور شخص کی نظر پڑے۔ ہر شخص مونچھ ہو یا چوٹی اس قسم کی گڑیاں دماغ کے کسی محفوظ گوشہ میں بٹھائے رکھتا ہے۔ تنہائی کی بے کھٹکے دنیا میں ان گڑیوں کو شعور کے چبوترے پر بھٹکاتا ہے یا خواب کے بے قابو عالم میں یہ گڑیاں اپنے آپ چشم باطن کے سامنے کھیلنے لگتی ہیں۔ غرض کوئی فرد بشر ایسا نہیں جس نے اپنے ذہن میں گڑیاں نہ سجا رکھی ہوں۔ اس لئے کہ کوئی انسان ان پڑھ یا پڑھا لکھا، بے زر یا دھن والا، ایسا نہیں کہ اپنے دل میں زندگی کے اعلیٰ منصوبے نہ باندھے۔ لطف تو یہ ہے کہ سماجی زندگی کے پہلو بے گنتی ہیں اور ہر شخص کئی کئی پہلوؤں سے اپنے اپنے منصوبے مجبوراً باندھتا ہے اور ہر ایسا منصوبہ ایک ذہنی گڑیا ہے۔ اس طرح انسان کا دماغ ایک حیرت ناک گڑیا خانہ ہے۔ کہیں روحانی گڑیاں ہیں تو کہیں سماجی۔ ایک کونہ میں سیاسی گڑیوں کے پرے ہیں تو دوسرے میں اقتصادی کی قطاریں۔ ایک طرف ادبیات والیوں کے جھرمٹ ہیں تو دوسری طرف سائنس اور حکمت کے

جھٹکے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

دماغ جان کی جان ہے اور سمندر کی لہروں کی طرح دماغی ترنگیں ریاضی کے ضابطوں اور سمجھ کے کوزے میں نہیں سما سکتیں۔ دماغ کی ہر لہر گڑیاں پیدا کرتی ہے اس لئے کہ دماغ نہ صرف گڑیا خانہ بلکہ گڑیوں کا ایک زبردست ان تھک کارخانہ ہے۔ عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ جب گڑیاں بن بنا کر اس گڑیا خانہ میں سج جاتی ہیں تو آپ اس گڑیا خانہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان سجی سجائی گڑیوں کے پیچھے ان گڑیوں کو مشین میں ڈھالنے والا اور اس ڈھالنے کی مشین کے کل پرزے اس کا عمل سب آپ سے پوشیدہ ایک طلسمات ہے حالانکہ یہ مشین سوتے میں یا جاگتے میں ہر لحظہ اپنا کام کئے جاتی ہے۔

زندگی کا سارا کھیل ان گڑیوں کا کھیل ہے۔ انسان کو یہ ذہنی گڑیاں پیاری ہوتی ہیں جس طرح بی ننھی کو اپنی چیتھڑوں والی عزیز ہوتی ہیں۔ بہیں انسان کے لئے ان ذہنی گڑیوں میں سے ایک آدھ گڑیا ایسی بھی چاہیتی ہو جاتی ہے کہ آدمی اس کے لئے اور سب گڑیاں نثار کر دیتا ہے اور اگر وقت آن پڑے تو جان جیسی عزیز گڑیا پر کھیل جاتا ہے۔

مثال کے لئے وطن پرستی کی گڑیا کو لیجئے۔ یہ گڑیا نوع انسان کے دماغ میں آج کل ادنیٰ تمام قسم کی گڑیوں پر اور ایشیا جیسے مذہبی گڑیا خانہ میں بھی چھا سی گئی ہے اور چھاتی جا رہی ہے ایک معمولی گمنام شہری جنگ عظیم میں لام پر جاتا ہے اسٹیشن پر اس کی دلبر اسے بوسہ دیتی ہے۔ محبت کی گڑیا کا گلا گھونٹ کر منہ سے صرف اتنا کہتی ہے:۔

"فرانس کے لئے"

ہندوستان میں "عزت" کی گڑیا جیل خانہ کے نام سے تھرّا اُٹھتی تھی۔ جیل خانے کی سیر کر آنے کے بعد یہاں آدمی ذات برادری باہر ہو جاتا تھا اب وہی ہندوستان ہے جہاں "مادرِ وطن اور سوراج کی خاطر" مہاتما اور مولانا جیل خانہ جانا فخر سمجھتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے برطانوی شہنشاہیت اور دفتر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے۔

جہاں گڑیا خانہ میں گڑیا خانہ ہو، جہاں دماغ کی ہر ترنگ گڑیاں ڈھالتی جائے وہاں نفسی گڑیوں کی قسمیں قائم کرنا اور ان کو گنوانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ البتہ دماغ کے گڑیا خانہ کی گڑیاں سجانے میں جن گڑیوں کا کھیل بہت بڑا اثر رکھتا ہے وہ دو قسم کی گڑیاں ہیں۔ ایک تو گھریلو اور دوسری مکتب خانے والی یہی وہ دو مقامات ہیں جہاں پہلے پہل ہمارے دماغوں کا گڑیا خانہ سجایا جاتا ہے۔ اور انسان جب سماج کے وسیع دائرہ میں قدم رکھتا ہے تو انہی گڑیوں کو لئے ہوئے۔

گھریلو گڑیوں میں دو زبردست گڑیاں ہیں ماں اور باپ۔ ماں باپ والی ذہنی گڑیاں ایسے نفسیاتی دھاگوں کے تانے بانے والے کپڑے سے بنائی جاتی ہیں کہ دماغی گڑیا خانے کی اور گڑیاں صرف ایسے ہی کپڑے سے بنی جا سکتی ہیں جس میں ماں اور باپ والی پُتلیوں کے دھاگے بھی بناوٹ میں شامل ہوں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ماں اور باپ سے متعلق جو نفسیاتی دھاگے ہیں ان کی دو بڑی نہ ختم ہونے والی پیچکیں[1]

---

[1] Complexes

ہوتی ہیں اور ان بیچکوں خصوصاً ان والی بیچک کے دھاگے کے بغیر داغی گڑیا خانہ کی اور گڑیاں سل ہی نہیں سکتیں اور زندگی کی آب رواں والی چادر بنی ہی نہیں جاسکتی۔ چند مثالیں اس مسئلہ کو واضح کر دیں گی۔

ننھے ننھے بچوں سے جن کی چونچ ابھی پھوٹی ہو اور جو پرندوں کی طرح سُریلی آوازمیں تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگے ہوں۔ ان سے محض ہنسی دلگی سے کبھی کوئی یہ پوچھ بیٹھتا ہے :-

"میاں بتاؤ تو تمھاری دلھن کہاں ہے؟"

"ہماری دُننن۔ نیں"

"واہ بھئی تو تم شادی نہیں کروگے؟"

"ہاں۔ چھادی کروں واں"

"تو پھر کس سے کروگے؟"

"کس سے کروں واں! اماں سے؟"

اس پر سب ہنس پڑتے ہیں اور پھر پوچھا جاتا ہے۔

"بھئی تم جانتے بھی ہو شادی کیا ہوتی ہے؟"

"ہاں"

"اچھا تو بتاؤ تو کیسی ہوتی ہے؟"

"آپا نے گنیا (گڑیا) کی کی تھی نا ویسی"

لڑکی سے کبھی ایسی بات چیت میرے تجربہ میں نہیں آئی لیکن نفسیاتی رجحانات اس کے متقاضی ہیں کہ لڑکیوں کا معصومیت کے عہد کا دولھا' ابا' یا کوئی ابا سا ہونا چاہیئے اور اس کی تصدیق نفس تجزیہ[۱] کے باوا آدم فرئیڈ[۲]

---

[۱] Psycho-analysis [۲] Freud

اور اُس کے پیروُں کی تحقیقات کرتی ہے۔

جب بچّے کی سمجھ بُوجھ پیدا ہوتی ہے اور اس کو پڑھنے بٹھایا جاتا ہے تو بچّہ فطرتاً پڑھنے کے جنجال اور اُستاد جی کے وبال سے بھاگتا ہے جی چراتا ہے اُستاد کو نہایت بُرا سمجھتا ہے کبھی اُستاد جی بیمار ہو جاتے ہیں تو اس کے ننھے دل کو خاص مسرت اور اطمینان ہوتا ہے اسی لئے بچّوں کے دل میں اُستاد کا احترام پیدا کرنے کے لئے ماں باپ والی گڑیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

"امّاں! یہ اُستاد جی بُرے ہیں ہم ان سے نہیں پڑھیں گے"

"نہیں بیٹا یوں نہیں کہتے اُستاد کا بڑا رتبہ ہے۔ اُستاد باپ کی جگہ ہوتا ہے خبردار بُرا نہ کہنا"

لڑکپن کے بعد اعلیٰ تعلیم کا زمانہ کسی درسگاہ یا یونیورسٹی میں گزرتا ہے دماغ کا گڑیا خانہ نئی نئی دلفریب گڑیوں سے سجتا ہے۔ درسگاہ سے محبت ہو جانی لازمی ہے اور جب انسان پیار میں آتا ہے تو اپنی درسگاہ یا یونیورسٹی کو مادرِ علمی پکارنے لگتا ہے۔

شادی خانہ آبادی ہو جاتی ہے اور آدمی خود صاحبِ اولاد ہو جاتا ہے تو بھی اُس کی محبت کا معیار ماں ہی رہتی ہے یہ ماں والی ہچکی بے ساختہ بعض اوقات اس کے منہ سے بول اٹھتی ہے۔

ایک صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے جب سفر سے واپس ہوئے تو ایک دن اپنے ایک یار نمار سے ملنے کو آئے اور دوست کو دیکھتے ہی پکار اٹھے:-

"بھئی یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ ہائیں تم تو پہچانے نہیں جاتے۔

Amma matre ol.

ارے میاں جب یہاں سے گیا ہوں تو اچھا خاصا چھوڑ گیا تھا۔"
"بھائی کچھ نہ پوچھو۔ بس خدا کا شکر ہے کہ پھر زندہ ملے۔"
"تو آخر کچھ بھی ہوا کیا تھا؟"
"ہوا کیا تھا۔ میعادی تپ تھی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔"
"میعادی تپ میں بڑی احتیاط چاہیئے۔ کسی نرس کو مقرر کر لینا تھا۔"
"نرس تو جب مقرر ہوتی مجھے ہوش بھی ہوتا۔"
"پھر تو بڑا ہی خدا نے فضل کیا۔ آخر تیمارداری کس نے کی؟"
"اور کون کرتا سوائے تمھاری بھاوج کے۔ وہ خدمت کی ہے۔ تیمارداری کی ہے کہ بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ کوئی ماں بھی ہوتی تو بس اتنا ہی کرتی۔"

دوست ظریف تھے مگر نفسیات داں، مسکرا کر چپکے ہو رہے۔
انسان سیاسیات کے اکھاڑے میں اترتا ہے تو بھی ماں والی پیچکش پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سیاسیات کی زبردست گڑیا وطن پرستی ہے۔ سیاسی رنگ جوں جوں چڑھنے لگتا ہے انسان وطن سے محبت کرنے کی وجہ ڈھونڈھتے ڈھونڈتے آخر مادرِ وطن کا گیت گانے لگتا ہے اور اس طرح ماں والی گڑیا اور وطن پرستی کی گڑیا میں چولی دامن کا سا رشتہ پیدا کر لیتا ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ یہ ماں باپ والی پیچکیں روحانی بلندیوں پر بھی ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ خالق کائنات کی محبت بھی ماں باپ کی سی قرار دی جاتی ہے۔
مکتب خانہ یا بالفاظِ دیگر اکادمی والی گڑیاں بھی انسان کے دماغی گڑیا نما پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ شاید صدیوں میں اکادکا ہی ایسے افراد نکلتے ہیں جو

ڈگری والی گڑیوں کو اپنی زندگی کا منتہی نہ قرار دیں۔ مادرِ علم کی گڑیاں کچھ ایسی دلکش ہوتی ہیں کہ لوگوں کی عمریں انھیں کے کھیلنے میں تیر ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اکادمی والی ادبیاتی گڑیوں میں ایک زبردست گڑیا شکسپیر ہے۔ ہندوستان میں بھی ہر اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اس سے بحث نہیں کہ ادبیات سے لگاؤ ہو یا نہیں۔ اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ثابت کرنے کے لئے اس گڑیا کا شیدائی بن جاتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو؟ ڈگری والی گڑیا اس گڑیا کی پرستش ضروری سمجھتی ہے اور لیکچر کے کمرے میں پروفیسر صاحبان اس گڑیا کو سامنے رکھکر چال کھیلتے ہیں۔ خود انگلستان میں بہت سے لوگوں نے اس گڑیا اور اس گڑیا کی ساختہ پرداختہ گڑیوں کے کھیل میں دماغ کی اور گڑیوں کو بالائے طاق رکھدیا اور ان کے کھیل کے پیچھے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اس انہاک اور پرستش کے ساتھ اگر یہ خود اپنی گڑیاں بناتے سنوارتے اور سجاتے تو ادبا ادبی گڑیا خانے میں کچھ گڑیوں کا اضافہ کر جاتے۔

یوں تو علمی گڑیا خانے کے ہر شعبے کی گڑیاں جدا جدا ہوتی ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ دلکش اور دلفریب ہوتی ہے لیکن عام طور پر ادبیات کا شعبہ ایک حیرت ناک طلسمات ہے۔ اور طرح کی علمی گڑیاں کھیلنے والے معدودے چند ہوتے ہیں۔ مثلاً ریاضی اور اسی قبیل کی گڑیاں بہت کم لوگوں کے دلوں کو بھاتی ہیں، لیکن ادبی گڑیوں سے نہ کھیلنے والے اول تو ہیں نہیں اور اگر کوئی ایک آدھ نکل آئے تو وہ عجائب خانے میں رکھنے اور ایک نوع خاص کی گڑیا کی طرح مطالعہ کے قابل ہوگا۔

زبان سماج کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسے ہوا۔ جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم کون ایسا ہے جو ایک مزے کی کہانی کہکر سنکر یا پڑھکر یا لکھکر خوش نہ ہو

یا اَوروں کو خوش نہ کر دے یہ کہانی کی دُنیا ہماری بنائی ہوئی ہوتی ہے اِس میں
جو تخیلی گڑیاں ہوتی ہیں وہ اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہیں اُن پر ہمیں پُورا قابو ہوتا ہے
کہانی پڑھنے یا سُننے والے بھی اِس لئے خوش ہوتے ہیں کہ اُن کا جھوٹ موٹ
کی دُنیا کو پسند کرنے والا فطری رجحان کہانی سے بھڑک اٹھتا ہے اور ایسی دُنیا
بنانے کو جی بھر بھرانے لگتا ہے یہ اور بات ہے کہ ہر ایک ایسی گڑیاں اپنے آپ
بنا نہ سکے۔ افسانے کی گڑیاں بہت سے لوگوں کے لئے بی ننھی کی گڑیوں کی طرح
جیتی جاگتی ہستیاں بن جاتی ہیں اَفسانہ نگار کا کمال یہی ہے کہ اِس جھوٹ موٹ
کی خلقت کو گوشت پوست والی گڑیوں سے ملتا جلتا بنا دے یہاں تک کہ اسکی
تخیلی ہستیاں لوگوں کے دُکھ میں سُکھ اور سُکھ کے سونے میں سہاگے کا کام
دینے والی غمگسار اور نشاط افزا ہستیاں ہو جائیں۔ دُنیا کے اَدب میں ایسا صاحب
کمال قصہ گو ایک زبردست قوت ہے۔ اِس کی گڑیوں سے کھیلنے والوں کی اِس
گڑیا خانہ میں کبھی کمی نہیں ہو سکتی اور اِس کی اِن تخیلی گڑیوں کے کھیل سے اِس کے
بے گنتی ہم جنس مسرت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اِس خصوص میں شاعر اور بھی آگے ہے شاعری کی شرط
اوّل بھی کہانی کی طرح یہی ہے کہ تخیلی گڑیاں پیدا کی جائیں۔ البتہ شاعر اِس بات میں
قصہ گو سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ الفاظ کے فطری ترنم سے اپنے تخیل کے
جلانے والے جادو کو اور جِلا دے سکتا ہے دُنیا کبھی شاعر اور قصہ گو سے سیر نہیں
ہوگی۔ بچپن کی کپڑے والی گڑیا کھیلنے کی اعلیٰ ترین اِرتقا کہانی اور شاعری کی
گڑیاں ہیں۔

اِرتقا کی گڑیا آج کل علمی گڑیا خانے میں ایک ہمہ گیر گڑیا ہے۔ اور ذہنی
گڑیوں کو اَنواع حیوانی کی طرح نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ اِس گڑیا کا یہ تقاضہ ہے کہ زمانے
کے بہاؤ کے گھستے سے ہمارے دماغ کے گڑیا خانے کی ہر گڑیا بدلتی جائے۔ رُوحانی ہر

یا مادی۔ مذہبی ہو یا لامذہبی۔ یہی گڑیا انجان طور پر بی ننھی کو بھی اُبھارتی ہے کہ وہ بھی
اپنی گڑیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں آج اِس جگہ سے اُس جگہ رکھدیا۔
اُلماری سے اُٹھایا طاق میں بٹھایا۔ اور کل اُن کے کپڑے لتّے اُتار زر زیور
نوچ ناچ ننگا بُچّا کر دیا۔ کبھی جی میں آئی تو نئے نئے جھم جھم کے کپڑے پہنا دیئے
اور کبھی کچھ اور سوجھی تو پرانی گڑیوں کو کسی کو دیدیا کہیں کونے کھدرے میں
پھینک دیا۔ نئی نئی گڑیاں بنوالیں اور پھر ان کے ساتھ بھی یہی برتاؤ یہی عمل
ہونے لگا۔ گڑیاں کھیلنے کی ایک اٹل شرط یہ بھی ہے کہ اِس قسم کا تغیر اور ہیر پھیر
بھی ہوتا رہے کیونکہ کھیل کی دلچسپی کا دوسرا راز تبدیلی ہے۔ وہ کھیل ہی نہیں جہاں
آپ اپنی دنیا نہ بناسکیں۔ لیکن اپنی دنیا آپ بناکر روز اس دنیا کو اسی حالت
میں دیکھنا اس میں تبدیلی نہ کرنا اس کی دلچسپی کا مٹانا ہے۔ جو لوگ اِس گڑیاں
کھیلنے کے طلسمات میں تبدیلی کی گڑیا سے بھاگتے ہیں ان کی زیست، خواہ وہ
افراد ہوں خواہ قومیں، ان کی گڑیوں کا کھیل ختم ہوچکا۔ گڑیاں کھیلنے کے لئے وہی
لوگ زیادہ موزوں ہیں اور زیادہ مسرت حاصل کرسکتے ہیں جو اگر بچے ہوں تو
اپنی چیتھڑوں والی اور اگر بڑے ہوں تو اپنی ذہنی گڑیوں میں ہر قسم کی تبدیلی
ہیر پھیر اور ردو بدل کو شوق سے ہونے دیں اِس گڑیا خانے کی دلچسپی اسی میں ہے۔
زیست جسے کہتے ہیں وہ یہی ہے۔

بدقسمتی سے انسان کا نفس جن ذہنی گڑیوں کا عادی ہو جاتا ہے اُن میں
کسی قسم کی تبدیلی کا خیال انسان کے دل میں بھی نہیں آتا۔ ماضی پسندی کی
گڑیا تبدیلی سے بہت بدکتی ہے اور انسان کو عادت کی آسایش اور سہولت کی
وہ چاٹ دے رکھی ہے کہ انسان پرانی گڑیوں کو سینہ سے لگائے رہتا ہے
اُن کو جگا جگا کر ذہن میں رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کی وہی مثال ہے کہ بچپن

کے چیتھڑوں کی گڑیوں کو سینت کر رکھیں اور جوانی اور بڑھاپے میں بھی
انھیں سے آنکھ بچا کر کھیل لیا کریں۔ ایسے لوگ ذہناً ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں
اور یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے آدمیوں کی تعداد دنیا میں کم نہیں۔ یہ ایک بدیہی بات
ہے کہ انسان کسی ایک خاص شعبے میں گڑیوں کی ارتقا جوانی اور بڑھاپے کے
تغیرات کے ساتھ ساتھ کرے لیکن دوسرے شعبوں میں بچے کا بچہ ہی رہے
کسی انسان کا دماغ اس کائنات کے ناپیدا کنار گڑیا خانہ پر احاطہ نہیں کر سکتا۔
اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر شخص سوائے ایک آدھ قسم کی گڑیوں کے
اور گڑیوں سے اسی حد تک کھیلتا ہے جس طرح بی ننھی ناک منکتی اپنے کپڑوں
کی گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔

جو نوجوان یونیورسٹی کی ڈگری کی گڑیوں سے کھیلتے ہیں ان کو ان گڑیوں
کے دربار جبّے اور دستار اور بھاری بھرکم چہرے سے اس مغالطے میں نہ پڑنا
چاہیئے کہ بس ہم نے بڑا تیر مار لیا۔ اب اس دنیا کے گڑیا خانے میں بقیۃ العمر
بھی گڑیاں۔ اکادمی والی کھیلنی ہیں۔ نہیں۔ اس گڑیوں کے طلسمات میں کوئی
گڑیا ایسی نہیں جو ہمیشہ ایک رنگ ایک لباس میں رہے جو سدا ایک جگہ ایک
ڈھنگ سے رہے یا جو مدام باقی رہے۔ خود ارتقا کی گڑیا کا پہلے وجود نہ تھا۔
آج وہ بھی گڑیا خانے میں چھائی ہوئی ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تبدیلی کی گڑیا
ہمیشہ اسی طرح اوروں کو تغیر کا ناچ نچاتی اور خود جوں کی توں رہے گی۔

اس دنیا کے گڑیا خانے کی تاریخی گڑیوں پر نظر ڈالئے۔ ہر عہد تاریخی اور
غیر تاریخی میں آپ کو ایک جھوٹ موٹ کی دنیا کی ہنسی ہنسائی گڑیاں دکھائی دینگی
یونانیوں نے اپنے قصص کی پیاری اور حسین دنیا بنائی۔ کائنات کی گڑیاں
کھیلنے والے ہاتھ نے کایا سی پلٹی تو یونانی گڑیاں جو اپنے زمانے میں جیتی جاگتی

سندر بھیتیاں تھیں ایک کونے میں جا پڑیں اور نئی نئی گڑیاں نئی نئی طرح سے
اس گڑیا خانے میں سج گئیں اور یہ ردو بدل کا دستور جاری رہا اور بظاہر کوئی
وجہ نہیں کہ جاری نہ رہے۔ اگر تاریخ انسان کے سب طبقات استدلال کی لڑ
میں پرو دیئے جا سکتے اور علم کی روشنی میں آتے اور ساتھ ہی ارض کی تاریخ
کے بکھرے افسانے بھی روشن ہوسکتے تو اُس وقت کہیں یہ حیرت ناک طلسمات
ٹوٹتا کہ اس زبردست گڑیاں کھیلنے والے نے کیا کیا کھیل کھیلے ہیں کس کس
طرح اس گڑیا خانے کو آباد کیا اور مٹایا ہے۔ مگر یہ مٹی کا کرہ ہے ہی کس شمار
میں؟ اِس گڑیا خانے کی وہ دُور کی گڑیاں جن کی جھل مل جھل مل سے رات
کا سنگھار اور نکھار ہوتا ہے۔ ان کی ابتدا اور ارتقا کی کہانی کس قدر حیرت ناک
اور دلچسپ ہوگی! اِس گڑیوں کے کائناتی طلسمات سے انسان کے دماغ
اور انسان کی اِس جنم بھومی کی گڑیوں کو کیا نسبت؟ بی ننھی کپڑوں کی گڑیوں
مٹی اور چینی کے کھلونوں سے گڑیاں کھیلتی ہیں۔ اپنی ایک دنیا بساتی اور
آباد کرلیتی ہیں۔ بڑے ہو کر ہم دماغ کی گڑیوں حکمت اور سائنس کے کھلونوں
سے ایک اپنی دنیا کھڑی کرلیتے ہیں۔ لیکن کائنات کی گڑیاں ستاروں کی
بنی ہوئی ہیں اور کم از کم اس خاکدان کی آبادی گوشت پوست کی ہے۔ اور
ان گوشت پوست والی گڑیوں میں خود کھیل کا لٹکا ہے۔ جھوٹ موٹ کی دنیا
بسانے کی چینک ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن پھر بھی یہ دُنیا کا گڑیا خانہ ایک
جھوٹ موٹ کی ہی دُنیا ہے۔ بی ننھی والی چیتھڑوں کی گڑیوں کی دُنیا ہے۔
ہم خواہ کتنی ہی ذہنی گڑیاں کھیلیں سائنس کے کھلونے بنائیں اصلیت
کے بھید کا پتا نہیں چلتا کھیلتے جاؤ نئی نئی گڑیاں اور کھلونے بناتے جاؤ۔
جن گڑیوں اور کھلونوں کو اصلی سمجھتے جاؤ وہ سب جھوٹ موٹ کی چیزیں

ہیں۔ آج کچھ ہیں کل کچھ۔ بی ننھی کی گڑیا والی شادی ہم موچھوں والوں کی نظر
میں جھوٹ موٹ کی ہے۔ کیا خود بی ننھی کی شادی جھوٹ موٹ کی نہیں؟
بی ننھی کے ہاں شادی کے بعد بال بچّے ہوتے ہیں۔ لیکن بی ننھی اور ان کے
دولہا کو اس بچّے کے ہونے میں سوائے اس کے اور کیا دخل ہے کہ ایک
زبردست کھلاڑی کی گڑیاں بنانے والی مشین کے یہ دونوں کے دونوں
دکھاوے کے کل پرزے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بی ننھی اور ان کے دولہا بچّے
سے اس طرح کھیلنے لگیں گویا ماں باپ پیدائش کے راز سے واقف اور اس
ننھی منّی دل کا چین آنکھوں کی ٹھنڈک گڑیا کا معرضِ وجود میں لانا ان کے
قابو کی بات ان کے ارادے اور سمجھے بوجھے فعل کا پھل ہے۔ جس طرح بی ننھی
اپنی چیتھڑوں کی گڑیوں والی اور بی ننھی کے دولہا اپنی لکڑی کے گھوڑے
اور دھجّی کے کوڑے والی دنیا بنا لیا کرتے تھے اسی طرح اب بھی یہ دونوں اپنی
بچّے والی گڑیا کے متعلق ایک جھوٹ موٹ کی دنیا بنا لیتے ہیں۔ بی ننھی اپنے
کپڑے کی گڑیا اور ان کے دولہا اپنے لکڑی کے گھوڑے میں جان نہیں ڈال
سکتے تھے بلکہ ان میں اپنی خواہش کی بنا پر جھوٹ موٹ کی جان مان لیتے تھے
اور اپنا دل خوش کر لیتے تھے بعینہ اسی طرح ان کو نہ تو یہ خبر کہ بچے میں جان کہاں
سے آتی ہے اور نہ یہ راز ان پر آشکارا کہ کس طرح آتی ہے لیکن اس ننھی
منّی انسانی گڑیا کے ڈھالنے میں ان دونوں کو اس طرح شریک رکھا گیا ہے
کہ اصلیت کا تو حال خاک بھی ان پر نہ کھلے لیکن اس قسم کا بادی النظر میں تعلق
بھی ضرور ہو جائے کہ یہ دونوں اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کا خالق سمجھنے لگیں
اور جھوٹ موٹ کی دنیا پیدا کرنے کے لئے یہ برائے نام تعلق ایک بہانہ بن جائے
واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا کا گڑیا خانہ جس کا عکس ہمارے دماغ کا گڑیا خانہ ہے ایک

جھوٹ موٹ کا ہی عالم ہے۔ بی ننھی کپڑے یا چینی یا مٹی کی اِنسانی شکل والی گڑیا کے سہارے ایک جھوٹ موٹ کی گڑیا بنالیتی یعنی اُس میں جان ڈال لیتی ہیں۔ اِسی طرح کائنات کے گڑیوں کے کھیل کی ایک موہوم اور محدود جھلک اور انسانی گڑیوں کے ڈھلنے میں بڑے نام کی شرکت کے حیلے ہم ایک جھوٹ موٹ کی دنیا بنالیتے ہیں۔ چنانچہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ میں خود ایک بے بس بے قابو اور بے خبر گڑیا ہوں اور کھیل کی ترنگ میں آکر مذہبی اور فلسفی نظامات کا ایسا گڑیا خانہ تیار کرلیتا ہے اور بھلا دے کی اِنتہا ملاحظہ ہو کہ خود اس کائنات کے گڑیوں کے کھلاڑی کے نام سے ایک گڑیا بناکر اپنے گڑیا خانے میں بٹھا دیتا ہے۔ اِنسان کی اِس ڈھٹائی اور جسارت پر کہ اپنی حقیقت سے بے خبر ہوتے کائنات کے زبردست کھلاڑی کو ایک گڑیا بنالیتا ہے ظرافت کی گڑیا لوٹ لوٹ جاتی ہے۔ اس اِنسان۔ اِس گوشت پوست والی گڑیا۔ جو بی ننھی کی چیتھڑوں کی گڑیوں کی طرح بے بس اور بے خبر ہے اس کی یہ ستم ظریفی بڑی بڑی کاوشوں کے ساتھ اس وقت تک جاری رہے گی کہ اس زمین کو جس کی گولائی پر اِنسانی گڑیوں کا کھیل ہو رہا ہے۔ کائنات کی گڑیوں کا زبردست اور بے نظیر کھلاڑی بے ضرورت اور غیر دلچسپ قرار دیکر ستاروں کے کسی پرانے کھنڈر میں توڑ پھوڑ اور پاش پاش کرکے پھینک دے۔

سُوزِ ماچنا

یہ مضمون فلسفۂ حیات کے رموز کو حل کرتا ہے اس میں نوجوانوں
سے خطاب کیا گیا ہے اور ان کو نڈر ہو کر موت کو قابو میں کرنے اور
بڑے بڑے کام انجام دینے کی ہمت دلائی گئی ہے اس کے علاوہ
موجودہ درسگاہوں کی تعلیم کے نتائج پر روشنی ڈالکر وہ تجویزیں پیش
کی گئی ہیں جو حقیقی معنوں میں تعلیم کے مفہوم پر مبنی ہیں۔ یہی باتیں دوسرے
ماہران تعلیم کے دلوں میں بھی آتی ہیں لیکن یا تو زبان پر نہیں آتیں
اور اگر زبان پر آتی بھی ہیں تو عملی صورت اختیار نہیں کرتیں۔ وہی
پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ " مدر انڈیا " (
Mother india) جیسی کتاب عالم وجود میں آئی۔ اس پر
بڑے بڑے ہمدردان قوم نے لے دے کی بہ چیخ پکار مچائی اور لاطائل
جواب دیئے لیکن اب تک یہ کسی سے بھی نہ ہوا کہ خرابی کی جو جڑ ہے اسکو
درست کریں۔ واردھا اسکیم بھی اس دکھتی رگ کا مداوا نہیں کرتی ان
امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مضمون کو پڑھیئے اور فاضل مضمون نگار
نے جس بے باکی اور بلند نظری سے نوجوانوں کے لیئے منشا تعلیم اور

مقصد زندگی کو پیش کیا ہے، اس سے حظ اُٹھائیے۔

اصل میں اُدیب مرحوم کا مطمح نظر یہ تھا کہ نوجوانوں میں ذوقِ اَدب کے ساتھ مردانہ ہمت، بے دھڑک و نڈر دل و دماغ، اعلیٰ کردار اور روحِ عمل کی تلقین کریں۔ یہی اُن کی زندگی کا مقصد اور یہی اُن کا پیام تھا۔ اس کی جھلک ان کے اکثر مضامین میں نظر آتی ہے۔ پھر اس پیام کو انہوں نے اپنی اِنشاء پردازی کے خاص انداز میں پہونچایا جس میں خوش مذاقی کی چاٹ اور ظرافت کی چاشنی ہوتی تھی جس سے سخن کی ذرا ظہور تلخی بھی پُر تبسم شیرینی اور حلاوت میں گھُل مل جاتی اور اِس لیے کہ ہر بات لطف اندوز پیرائے میں دلوں میں اُتر جائے اور گھر کرے یہی وجہ تھی کہ اُدیب مرحوم اپنی زندگی میں جامعہ کے نوجوانوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ بیسیوں نوجوان اُن کے پاس آتے اور اَدب کا ذوق اور رہبری حاصل کرتے۔ یہی نوجوان اَب تصنیف و تالیف اور صحافت کے میدان میں جولانیاں دکھا رہے ہیں اور اچھی خاصی شہرت کے حامل ہیں۔ یہ مضمون پڑھکر مذکورہ باتیں آپ پر خود آجاگر ہو جائیں گی۔

یُوں تو اِنسان کا قدم قدم پر ایسے سوالات سے سَامنا ہوتا ہے کہ اُن کا جواب، تشفی بخش حقیقت کشا جواب اِنسان کے بس کی بات نہیں لیکن حضرت آدم کے عالی دماغ سپوتوں نے خاص طور پر تین سوالوں کو اہم سمجھا ہے۔ کہاں سے؟ کیوں؟ اور کہاں کو؟ اِن تین کھونٹیوں پر اِنسان کے سارے دماغی سرمایہ کی پوٹلیاں لٹکی ہوئی ہیں اور اِس لیے

شک نہیں کہ پوٹلیاں دیکھنے کو پھولی پھالی ٹھونسی ٹھنسائی اور بھاری بھرکم
معلوم دیتی ہیں مگر ہاتھ لگانے پر یہ راز کھلتا ہے کہ یہ خالی خولی باتوں کی
ہوا سے فٹ بال کی طرح پھلا دی گئی ہیں اور اشرف المخلوقات والی نوع
کے بڑھیا دماغ والے افراد ان ہوا کی پوٹلیوں سے دماغی فضا میں ذہنی
ورزش فرماتے رہتے ہیں یعنی ارتقا کے ہر عہد میں ان گیندوں کی ہوا
نکل نکل جاتی ہے اور یہ کہیں کہیں سے پلپلی پڑ جاتی ہیں۔ اور اس وقت
بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ زمانہ انتظار کرتا ہے کہ آسمانِ انسانیت کا کوئی
نیا ستارہ طلوع ہو اور یہ زبردست ہستی تخیل کے دستے کو منہ کے پمپ میں
پچی بٹھا کر ان پوٹلیوں، ان گیندوں میں پھونک بھر دے۔

اِن تینوں سوالوں میں سے "کیوں" والا سوال عملی پہلو سے زیادہ
دلچسپی رکھتا ہے۔ کیوں کہ اُن لوگوں کے لئے جو پشتِ پدر اور بطنِ مادر
کی شاہراہ سے گزر کر اس دُنیا کی روشنی یا تاریکی میں آ چکے ہیں یہ سوال
کہاں سے؟ صرف سال گرہ کے ہی دن شاید خفیف سی دلچسپی پیدا کرے
تو کرے، اِسی طرح یہ سوال۔ کہاں کو؟ اُن حضرات کی عنایت سے جو اس
دنیا کے نگار خانے سے بیزار ہو کر قبر کے تاریک اِسٹیشن سے ایک اندھیری
اَن دیکھی دنیا کو سدھارتے رہتے ہیں۔ اِس قدر ڈراونا سا ہو گیا ہے کہ
واقعی انسان اِس سوال کی سوچ میں ڈوب جائے تو اُس پر "زندہ
درگور" کی مثل پوری طرح پھب جائے۔ سوائے چیدہ چیدہ ہستیوں کے اِنسان
عموماً ان دونوں سوالوں۔ کہاں سے؟ اور کہاں کو؟ — سے جی چراتا ہے
اِنسان کو اگر کچھ دلچسپی ہوتی ہے تو اس سوال سے۔ کیوں؟ اِنسان خدا جانے
کہاں سے آیا اور کہاں جائیگا ان باتوں کا خدا ہی جانے کیا صحیح حل ہے۔ البتہ یہاں کیوں

آیا ہے؟ ذرا ایسا سوال ہے کہ ہماری زندگی۔ زمانۂ حال کی زندگی سے متعلق
ہے اور شاید اس کے حل ہونے سے۔ ایک حد تک بھی حل ہونے سے ہماری
زندگی کو روحانی نہ سہی مادّی۔ سائنس والی ہی سہولتیں ہاتھ لگ جائیں، سماجی
حیات ایسی ہو جائے کہ پیٹ بھر کے کھانا، نیند بھر کے سونا، جی بھر کے دولت خانے
کے مزے ہی نصیب ہو جائیں۔ اور ذہنی چہل قدمی کے لئے ادبی اور علمی باغ اور
پارک لگ جائیں چاہے یہ زبردست پہیلیاں۔ کہاں سے؟ اور کہاں کو؟ بوجھی
جا سکیں یا ہمیشہ کی طرح ان کی بوجھن کبریت احمر اور پارس کے پتھر کی تلاش ہی
رہے۔ یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کیوں والے سوال سے بھی بہت کم آدمی
دلچسپی رکھتے ہیں حالانکہ یہ سوال ایک بڑی حد تک روزانہ زندگی سے گتھا ہوا
سا ہے۔ عامۃ الناس کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ اپنے پیٹ میں کھانا اور اپنی
بغل میں بیوی ہو اور بیوی کے پیٹ میں بھی ان اور گود میں بچہ ہو اگر یہ بات
میسّر آ گئی تو بس یہ عملی جواب ہے اس سوال کا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟
اور یہ ماننا پڑے گا کہ ایک طرح سے ہے یہ جواب لاجواب۔ ایک نہایت پست
معاشیاتی سطح کے آدمی کے سامنے جوار یا باجرے کی روٹی رکھی ہے اور ایک
معاشی زینے کے سب سے اوپر کی سیڑھی والے بزرگ کے سامنے خستہ
باقرخانی یا تحفہ کیک چنا ہوا ہے۔ یہ مان لیجئے کہ دونوں اتنے بھوکے ہیں کہ
آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ دونوں کے
مزے میں کسی قسم کا فرق بتلایا جا سکے۔ دونوں یکساں طور پر مزے مزے
سے اپنا دوزخ بھرتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور طرح کی بھوک کا حال ہے۔ ایک
کالی کلوٹی گلے میں گلوری اڑائے مہترانی اپنے مہتر کے لئے اسی قدر سرمایۂ
مسرت ہے جس قدر کسی صاحب کے لئے ان کی بالوں کی گچھوں، بھڑکیلی

ساڑی والی عینک کی حد تک تعلیم یافتہ بیوی ہو سکتی ہے۔ کوئی ایسا نفسیاتی پیمانہ
ابھی ایجاد نہیں ہوا ہے جس سے بخار کی طرح ایک ہی قسم کی لذت کے مدارج آدمیوں
کے کسی حصہ پر لگا کر معلوم کئے جا سکیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے میں
کم و بیش ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو کیوں کا سوال اُٹھاتے اور اس کے حل
کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان کی یہ سعی ہوتی ہے کہ اپنے یہاں آنے کی
علم سمجھی جائے اور اگر اس پہیلی کی کچھ بھی غلط سلط بوجھن ہی ہاتھ لگی اور انھوں
نے دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا اور ایک لخت دنیا کی کایا پلٹنے کی
دُہائی مچا دی۔ اُن کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اُن کی اُلجھن پر کاربند ہونے
سے دُنیا کے دُکھ درد نا انصافیاں امراض خون خرابے اور بے گنتی بُرائیاں جو
انسان کی سماج پر ہمیشہ چھائی رہتی ہیں ایک دم سے خواب پریشاں کی طرح
ناپید ہو جائیں گی۔ مگر اس گُتھی کے سلجھانے کے پیچھے پڑ جانے والی چیدہ چیدہ
ہستیاں گنتی کی ہی ہوتی ہیں اور زمانہ پشتہا پشت صدیوں کے مفصل سے ہی
ایسی ہستیاں پیدا کرتا ہے۔ وہ دماغ خاص خاص ہی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو
اس اللہ میاں کی ڈالی گرہ کے کھولنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں لیکن بغور
مطالعہ کرنے سے یہ مزیدار بات آشکارا ہوتی ہے کہ کوئی ناخن ایسا نہیں کہ جس نے
جان بوجھ کر یا انجانی سے اس گرہ کے کھولنے کی تھوڑی بہت کوشش نہ کی
ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کروڑوں تو بس یوں ہی برائے نام زور لگا کر رہ جاتے
ہیں اور کروڑوں میں سے اکا دکا باہمت بندے پنجے جھاڑ کر اس گرہ کے
کھولنے یا کاٹنے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر ان کی
بلا سے۔ اُن کو صرف یہی دُھن لگی رہتی ہے کہ کسی طرح اس معمے کو حل کیا جائے
اور وہ اسی اُدھیڑبن میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں یہاں تک کہ موت

اپنے اٹل ناخن سے اُن کی رُوح اور بدن والی گرہ کو کھول دیتی ہے۔
انسانی زندگی کی مختلف منزلوں میں جوانی وہ منزل ہے جہاں انسان
کی جان کی اُمنگ ایک طرف تو موت کے خیال اور خوف کو پاس آنے نہیں
دیتی تو دوسری طرف آدمی کی بوٹی بوٹی اور رونگٹے رونگٹے کو آبِ حیات سے
برسات کی طرح سیراب کر دیتی ہے اور نوجوان کے کل اعضا۔ دل اور دماغ۔ اٹھتی
جوانی کی ترنگ میں نڈر ہو کر اس دنیا کی حیات کے مزے لوٹتے ہیں۔ چونکہ
نوجوان کے ہر بن مو سے زور اُبلتا رہتا ہے۔ دُنیا ہر پہلو سے دلچسپ معلوم
دیتی ہے اور طرح طرح کی جیت پر جیت۔ مزے پر مزے حاصل کرنے کے لئے
ایک لاتناہی میدان دکھائی دیتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جوانی کی اُمنگ
اس کو بہت جلد محسوس کرنے لگتی ہے کہ یہاں ہر قدم پر مسرت کے حاصل کرنے
کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہزاروں رکاوٹوں کا مقابلہ کیا جائے اور جسم اور دماغ کو
دکھ کی تربیت دی جائے تاکہ روح مسرت کے مزے لینے کے لئے منجھ منجھا کر
تیار ہو جائے۔ دوسری بات نوجوان کو یہ محسوس ہوتی ہے کہ انسان جن جن
باتوں کو اپنے لئے باعث مسرت سمجھتا ہے جن کی دل سے آرزو کرتا ہے وہ
سب باتیں ہاتھ نہیں لگ سکتیں۔ اور ایک تیسری زبردست اور غضب کی صداقت
اس پر یہ کھلتی ہے کہ ہر مسرت، ہر جیت عارضی ہے یہاں تک کہ خود ہماری
عضو بندِ حیات کا بھی بند بند اور جوڑ جوڑ ایک دن الگ الگ کر دیا جائے گا اور
اخذ مسرت کا موقع اور ذریعہ دونوں کے دونوں جس طرح بن مانگے دیئے گئے
تھے بن پوچھے چھین لئے جائیں گے۔ نوجوان جب پیاری سے پیاری آرزوؤں
کا خون اور اچھی اور بُری، حسین اور بھونڈی ہستیوں کو ملیا میٹ ہوتے دیکھتے
ہیں تو ان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور رفتہ رفتہ یہ پورا کرّے کا کرّہ ایک بھیانک

بھاڑ نظر آتا ہے۔ جہاں موت کا بھڑبونجا آرام سے بیٹھا ہوا ہے اور بھاڑ ہے
کہ بھن رہا ہے۔ جوانی کی اُمنگ کے باوجود تھر تھرا اُٹھتا ہے اور خوف کی بخ خون
کو ٹھنڈا کرنے لگتی ہے لیکن پھر بھی ہر نوجوان ایک دفعہ تو جوش جوانی میں خم
ٹھونک کر سورما چنا بن ہی جاتا ہے اور اس عالمگیر بھاڑ کو پھوڑنے کی اُمنگ
اُس کے دل میں لہرا ہی جاتی ہے۔ ہر نوجوان اس دماغ اور بل بوتہ کا نہیں
ہوتا کہ اس زبردست مقابلے میں جو لوہے کے چنے چبانے اور نہیں پاپڑ بیلنے
پڑتے ہیں۔ اِن سب کڑیوں کو جھیل جائے۔ چنانچہ بیشتر نوجوان اس گھمسان
کے مقابلے میں جوا ڈال دیتے ہیں اس آنچ کو سہار نہیں سکتے اور ہراساں
ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور کسی سورما چنے کے دامن کا سہارا لے لیتے ہیں اور
اس کثیر التعداد بھیڑ بکری جیسے طبقے میں شامل ہو جاتے ہیں اور اسی کو بہت غنیمت
سمجھنے لگتے ہیں کہ اس دنیا میں اور ایسی حالت میں کہ قبر کے بھیانک تنکم کے لئے
نہ معلوم کب بھنا بھنایا چبینا بن جائیں جو مسرت کہ ہاتھ لگ جائے، جو دم سانس
لینے کی مسرت میں گزر جائے۔ بہت ہے۔ یہ حال بدقسمتی سے حضرت آدم کے
بیشتر فرزندوں کا ہے۔ لیکن صدہا سال کے وقفے سے ایسے سپوت ضرور نکل
آتے ہیں جو اپنی جوانی سے لے کر آخر دم تک سورما چنا ہی رہتے ہیں۔ اسی لوہ
میں رہتے ہیں کہ زندگی کی طلم سمجھیں اور سمجھ کر دنیا کے خدو خال بدل دیں جیتا
کے ہر شعبے میں نئی رُوح پھونک دیں اور نوع انسان کو اس خطرناک بیچارگی
کے ساتھ جگتی کے بھاڑ میں بھننے سے بچالیں۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کی دنیا
آخر میں چل کر عزت کرنی سیکھ ہی لیتی ہے اور پست ہمت لوگ موت کے مقابلے
سے عاجز آکر اُن ہی خیالات کے چھالکوں میں پناہ کی غرض سے منہ چھپاتے
ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس ایک آنچ میں پھنک جانے والی پناہ میں اُن کو

بقا اور امن نصیب ہو یا نہ ہو۔

زندگی کی سورما پننے والی منزل میں سے ہر شخص گزرتا ہے اور ایک دن صحیح معنوں میں یہی ہو گی کہ اس منزل سے ہو کر گزرنے والی نسلیں پست ہمت اور خوف زدہ ہو کر اس بھاڑ کے پھوڑنے کی عظیم مہم سے جی ہار نہ دیں۔ ان میں کی ہر ایک ہستی اپنے فطرتی سورما پنے پن کو ہاتھ سے نہ دینے پائے۔ یہ مردانہ رجحان اُن میں راسخ ہو جائے اور خواہ آخری جیت ہو یا نہ ہو۔ قبر کی ہولناک اور تیرہ و تار گہرائی کے کنارہ پر بھی ان کی تعلیم اور تربیت یافتہ روح ہار نہ مانے بلکہ دم واپسیں کا آخری خراٹا اوروں کے لئے للکار ہو کہ ہاں بڑھتے جاؤ۔

اِن معنوں میں ہندوستان کی موجودہ تعلیم تعلیم ہی نہیں ہے۔ نوجوانوں کے عین اس زمانے میں جب کہ ان کی جوانی کی امنگ ان کو بے خوف بنائے رکھتی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس بے خوفی۔ اس سورما پنے پن۔ کو ابھارا اور ان کی سرشت کے ہر پہلو پر اس کو حاوی کیا جائے اُلٹی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر پہلو سے ان کے ہر پہلو سے ان کے اُٹھتے داعغوں میں خوف بٹھایا جائے۔ ہر چیز ان کے سامنے اس طرح پیش کی جائے کہ نوجوان بس یہی سمجھیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ بڑے بڑے لوگوں اور ماضی کو اس قدر بانس پر چڑھایا جاتا ہے کہ وہ لوگ گویا ہماری طرح بشر نہیں تھے اور وہ زمانہ بھی ہمارے موجودہ زمانے کی طرح نہ تھا۔ طبع خداداد (جی نی اس) کا راگ اس قدر گایا جاتا ہے کہ نوجوان اس کو ایک زبردست معجزہ سمجھنے لگتے ہیں جو صدیوں ہی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر نوجوان طبع خداداد لے کر آتا ہے اور کسی نہ کسی خاص کام میں وہ اپنے جوہر دکھانے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے۔ تعلیم کے غلط بیہودہ اور محدود نظامات اور

طریقے سب طرح کے نوجوانوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ رجحانات کے نفیس نفیس امتیازات، طرح طرح کے مذاق کے لطیف فرق، اور کیریکٹر کی نازک بوتیں یہ سب باتیں اور یہی اصلی باتیں ہیں۔ ایک طرف رکھ دی جاتی ہیں۔ چند گنتی کے مضامین کے پھیر میں ہر متنفس کو ڈال دیا جاتا ہے اور پھر نہایت اہمیت اور چھوٹ موٹ کی دانشمندی کے لہجے میں جتلایا جاتا ہے کہ جی پی اس بڑی چیز ہے اور صدیوں ہی میں خوش نصیب ملکوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اول تو ان بڑے بڑے عینک باز کتاب کے کیڑے پروفیسروں سے پوچھا جائے کہ جی پی اس، ہے کیا بلا؟ تو سوائے بہکی بہکی باتوں کے اور کوئی جواب نہیں ملے گا۔ ہر نوجوان ایک طبع خداداد ہے۔ اگر خوش قسمتی سے مدرسہ، کالج اور جامعہ کی ریوڑی کے پھیر میں اپنے رجحان کے خلاف نہ آن پھنسا تو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک دن اپنی طبع خداداد کی بساط بھر دنیا میں اپنا سکہ بٹھا ہی دے گا ورنہ ان غلط نظامات تعلیمی اور ان کی وجہ سے سماجی اور سیاسی اور معاشی غلط زہریلے گردوپیش میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ طبع خداداد کے اصلی خدوخال کو مسخ کر دیا جائے، جوانی کی امنگ کو دبا دیا جائے اور شعور ماسبق بن کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے۔ نوجوان بلحاظ جسم و صورت نوجوان نظر آئیں لیکن نفسی اعتبار سے یا تو ٹھٹھر ٹھٹھر کر بچے کے بچے ہی رہ جاتے ہیں یا ان پر طفولیت ثانیہ سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کی حالت نہایت عبرتناک ہوتی ہے اور دنیا کی کوئی بڑے سے بڑی جی ڈی اس سے بڑھ کر نہیں۔

اس قسم کی تعلیم کا بڑا زہریلا اصولی اثر یہ ہوتا ہے کہ نوجوان پہ خوف کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ان کو اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہتا۔ ان کو کسی راستے پر چلنا ہو تو اکیلا نہیں چلا جاتا۔ کسی مصنف کی کتاب ان کو سہارا دے، کسی مقولے کی انگلی

پکڑ لیں اور راستہ ایسا ثابت ہو کہ عام راہ گیر اسی پر چل رہے ہوں تو تو قدم اٹھتا ہے ورنہ بچوں کی طرح ذہنی طور پر خواہ مخواہ پکار کر ممکن ہی نہیں کہ ایک قدم بھی اٹھائیں۔

دنیا میں سورما چنے اس لئے کم ہوتے ہیں کہ نوع انسان نے اپنے نفس کے گلے میں خوف کی پھانسی ڈال رکھی ہے۔ موت سے اس دنیا میں بحالات موجودہ مفر نہیں۔ اور اگر ہر وقت موت کے خوف ہی میں انسان مبتلا رہے تب بھی موت بخشے گی نہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ خوف کو دل میں راہ دی جائے۔ انسان کی ساری خرابیوں کی جڑ خوف ہے۔ اس خوف کا منبع موت ہے۔ جب تک قلب اس خوف سے پاک اور صاف نہ ہو دنیا میں کوئی شخص یا قوم سورما چنا نہیں بن سکتی اور جب سورما چنا نہیں بن سکتی تو یہ بات یقینی ہے کہ اس سے کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا اس میں وہ ہستیاں جو فطرت کی گہرائیوں کو گھنگھول ڈالیں جن کے دماغ سطح ارض پر حکومت کا سکہ بٹھلا دیں نہیں پیدا ہو سکتے۔

بدقسمتی سے نوع انسان نے غیر فانی بن جانے کی خواہش کے باوجود اس بات کو عملاً مان رکھا ہے کہ اس زمین پر بقا کا خیال ایک خام خیال، ایک محال سی شئے اور ایک جنون ہے۔ اس کا خودکشی کا سا اثر یہ ہوا کہ دنیا میں جو لوگ واقعی سورما چنا بننے کی صلاحیت رکھتے تھے انھوں نے اپنی زبردست قوت ـــــ اپنے سورما چنے پن ـــــ کو انسان کے عظیم ترین دشمن۔ موت کے مارنے کے بجائے اس بات میں صرف کیا کہ الٹی اس انسان کی جان کی دشمن کا ہی ہاتھ بٹایا۔ فاتح شہنشاہ اور خدا جانے کیا کیا بننے کے لئے اپنے نوعی بھائیوں کو ہی موت کا شکار کرایا اور اس کثرت سے دل کھول کر کرایا کہ موجودہ سطح ارض کے ہر چپے کا ذرہ ذرہ خوں چکاں زبان سے اس کی گواہی دے سکتا ہے۔

انسان کی اصلی جانی دشمن موت ہے۔ خالق کائنات نے یہ سب سے بڑی رکاوٹ انسان کے راستے میں اس لئے رکھی ہے کہ اس پر جیت پانے کے بعد ہی کہیں انسان انسان بن سکے گا۔ نوع انسان کا متحدہ فرض ـــــ اس عالم میں آنے کی واحد غرض اس حیات کی رلم اگر کوئی ہوسکتی ہے تو یہی کہ انسان اپنی سرشت میں ودیعت کی ہوئی اس قوت سے جو جوانی میں نشو ونما پاتی ہے۔ اپنی جنس کے سب سے زبردست دشمن پر غالب آئے۔ اس دشمن پر فتح پانا ہنسی کھیل نہیں۔ جرمنی اور اتحادی قوتیں اور پھر ان جیسی کروڑوں قوتیں بھی اس زبردست دشمن کی چیرہ دستیوں کے آگے ہیچ ہیں۔ اس پر جیت پانے کے لئے نوع انسان کی متحدہ کوششوں اور پھر وہ بھی قرن ہا قرن کی ان تھک کوششوں کی ضرورت ہے۔ اگر ارتقاء کا تصور محض ایک ڈھٹ بندی یا ڈھکوسلا نہیں ہے تو انسانیت کی اعلیٰ ترین ارتقا یہ ہی ہوگی کہ انسان موت پر جیت پائے مادے کو روح کر دکھائے اور اس کے بعد انسان انسان کہلائے۔ یہ زبردست فتح انسان کو اسی وقت نصیب ہوگی کہ عالم انسانیت میں سچی برادری قائم ہوجائے۔ جنگ وجدل آپس کی خانہ جنگی ناپید ہوجائے اور علم عمل اور عمل علم بن جائے۔

اب آپ انسان کے نظامات تعلیمی کو صرف دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ درسگاہیں جہاں اپنے ہی ہم جنسوں کو مار رکھنے، کھا جانے اور لوٹ لینے کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ کامیاب قوموں کی درسگاہیں ہیں اور دوسری وہ درسگاہیں جہاں نوجوانوں کو اس لئے سدھایا جاتا ہے ہمارے جو ہم جنس ـــــ کامیاب قوموں کے افراد ـــــ ہم کو کچلے اور ننگے جاتے ہیں اور ہمیں خانماں برباد کر رہے ہیں ان کا مقابلہ کیا جائے اور اس مقابلے کے لئے زبردست ہتھیار تیار کئے جائیں موت اس تماشے کو دیکھتی ہے تو ایک دفعہ تو ظرافت کی دیوی موت کی پسلیوں میں بھی گدگداہٹ پیدا کر ہی دیتی ہے۔ اس لئے کہ یہ منظر بے انتہا ظرافت خیز ہے اور ظرافت کا نشتر موت

سے بھی نہیں چوکتا۔

اگر دنیا کو واقعی سورما چنے پیدا کرنے ہیں اور عالمِ انسانیت کو انسان بننا ہے تو اس رکیک خودکشی والے تعلیمی مطمحِ نظر کو بدلنا پڑے گا۔ آپ جس طرح طبع خداداد کو مسخ کیا جاتا ہے اس طریقے کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور نوجوانوں کے سامنے یہ انسانیت کا شاندار مقصود رکھنا ہوگا کہ انسان کا انسان کو مار لینا کوئی بڑے سورما پن کی بات نہیں اصلی مارنا تو انسان کے سب سے بڑے دشمن کو مارنا ہے اور اس کام کے لئے ہر نوجوان کو سورما چنا بننا ہوگا۔ ان فطرت کی قوتوں کو ہاتھ میں لینا ہوگا جن کے گھیرے میں لاکر آخر ایک دن موت کو موت کا پیغام دیا جائے گا۔ اور عالمِ انسانیت کے لئے بقائے دَوام کی بزرگ ترین نعمت علم کی کان کا بے بہا گوہر ــــ آخری جیت ــــ انسان کو نصیب ہوگی۔

یہ بحث کہ موت کے جال بحق تسلیم ہونے کے بعد اس دنیا میں آبادی کی جگہ نہیں رہے گی اور انسان کا بڑھاپے میں بھی جنبار رہنا اجیرن سا ہو جائے گا۔ یہ اور ایسی ہی اور باتیں قبل از وقت ہیں۔ اس لئے کہ علم کی وہ انتہا جو اس دنیا میں موت کا کام تمام کر دے ہمارے تخیل میں بالفعل نہیں آسکتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہمارے موجودہ خوف آلودہ اور نامکمل نظریے اس وقت علم کے کس گوشے میں پڑے ہونگے جس طرح آج یونانیوں کے علوم طبیعی محض سائنس کے ارتقائی تاریخ کی طفلانہ آرائش ہیں۔

فی الحال تو اس کی توقع نہیں کیجا سکتی کہ نظاماتِ تعلیمی میں کوئی اصولی تبدیلی ہو سکے۔ جن نوجوانوں کے دل میں سورما چنا بننے کی آرزو چٹکیاں لے۔ اور کون ایسا واقعی نوجوان ہے جس کے دل میں یہ رفیع الشان آرزو کبھی نہ کبھی اُبھرے۔ اور یہ نوجوان اس استدلال کے قائل ہو جائیں کہ سورما چنا پن سے کام لینا ہی کیونکہ

والے سوال کا صحیح جواب ہے۔ اُن کی منفعت اور فائدے کے لئے چند اُمور کی وضاحت بے جا نہ ہوگی۔

سوربا چناپن دوسرے الفاظ میں قوت کی وہ اِنتہائی صورت ہے جس کا کام حیرت ناک معجزہ پیدا کرنا ہے۔ موت کا بھڑ بھڑ بوتجا نوعِ انسان کو اب تک کبھی کا چٹر پٹر بھون بھان چکا ہوتا اگر انسان میں سوربا چناپن — تخلیقی قوت ودیعت نہ کی گئی ہوتی۔ موت کا بھاڑ ہر وقت گرم رہتا ہے۔ لیل و نہار کا کوئی لمحہ اس دردناک بھننے بھنانے سے خالی نہیں۔ خود اِنسان اپنی حماقتوں سے موت کا ہاتھ بٹاتا اور طرح طرح سے اپنے ہی ہم جنسوں کو گھیر گھار کر اس بھاڑ میں جھونک دیتا ہے۔ باوجود ان تمام باتوں، اس موت کی گرم بازاری کے۔ نوعِ اِنسان کو بھون کر مٹا دینا ابھی تک موت کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِنسانوں میں سے بیشتر افراد اس قدر سوربا چنا ضرور ہیں کہ ایک آدھ بچہ اس مقصدِ عظیم کو جان بوجھ کر پیشِ نظر رکھ کر نہیں تو لذت کے گوندے کی چاٹ ہی میں پیدا کر لیں۔ اس طرح انجان طور پر حضرت آدم کے پوتوں نے سوربا چنے پن سے کام لیا اور موت کا مقابلہ کیا اور ایک طرح یہ مقابلہ کامیاب بھی رہا اس حد تک کہ نوعِ انسان مٹنے نہیں پائی۔

اِنسان کی رُوح عہدِ شباب میں یہ تخلیقی صورت اِختیار کرتی ہے اور اگر اُوپر کا استدلال صحیح ہے تو پھر اس کو مان لینا پڑے گا کہ اس سوربا چنے پن۔ اس موت کے نڈر پن۔ اس جان کی اُمنگ اِس پیدا کرنے والی قوت کے عطیہ ہی سے موت کا عالمگیر بھاڑ پھوڑا جا سکتا ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ ہمارے نظاماتِ تعلیمی میں یہی وہ چیز ہے جو نصاب میں شامل نہیں جس کی نوجوانوں کو ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ اس معاملہ میں نوجوانوں کی جہالت اور اِس قوت کے اِرادے کو مطلق العنان چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اِس قوت سے اندھا دھند جو جی چاہے کام لیں بشرطیکہ وہ اتنی اِحتیاط ملحوظ رکھیں

کہ اس بارے میں اپنی کسی حرکت کو عام طور پر سماج کی نظر میں یا سماج کے کان نہ پڑنے دیں۔ دُنیا بھر کی درسگاہیں اِس معاملہ میں بڑھیا عورتوں کی طرح پپلا کر لکّا را ٹھتی ہیں۔

' ہا! یہ بُری بات، گندی بات ہے'

اور اطمینان سے نوجوانوں کو ناواقفیت کے ہاتھوں اِس قوت کو ضائع اور ملیا میٹ کرنے اور پانی کی طرح بہانے اور سماجی گندگی پیدا کرنے کا پروانہ دے دیتی ہیں، اِس قوت کا ایسا اِستعمال جو موت کی شکست کے لئے نہ ہو گندگی ہے۔ نوجوانوں کو اِس سورما پنے پن کا اِحترام سیکھنا پڑے گا۔ اس کو ذہن نشین کرنا پڑے گا کہ یہ خالق کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ زور شور یہ گرما گرمی اِس لئے عطا کی گئی ہے کہ ایک دن۔ اس ساری مٹی اِس زمین کو ایک زندہ ہستی بنا دیا جائے۔ تمام شہر بے مہار عناصر کو عضو بندی کے شکنجے میں لے کر محض اِس قوت سے ان کو جان بخشی جائے۔

نوجوانوں کو دوسری بات یہ سیکھنی ہوگی کہ یہ ہی قوت یہ ہی سورما پنا پن ہے جو انسان کے دماغ، جذبات اور روح کی روحِ رواں ہے۔ اِس سے گوشت پوست والی ہستیاں ایک جانب پیدا ہوتی ہیں تو دوسری جانب یہی قوت، مختلف پہلوؤں سے کائنات کی قوتوں پر ہاتھ ڈالتی ہے اور اُن کو اپنا مطیع اور منقاد بناتی ہے۔ یہی سورما پنا پن عقل ہے ایک خاص پہلو سے۔ تخیل یہی ہے ایک اور نقطہ سے، اور اِن دو لطیف صورتوں کو اِختیار کر کے اِس قوت نے ادبیات، فنونِ لطیفہ، علوم طبعی اور سماجی کا لازوال خزانہ پیدا کر دیا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ مختلف علوم کا قالب اِختیار کر لیا تا کہ موت کا مقابلہ کیا جائے۔

ہر نوجوان سورما پنا ہے اور اس قوت کے احترام اور اس کی نیرنگیوں کو سمجھ لینے کے بعد ہر سورما پنے کا پہلا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ اس قوت سے اِنسانی گوشت

پوست والے لاؤ لشکر کی تعداد بڑھائے اور ساتھ ہی ساتھ اس لشکر کے لئے ذہنی اور روحانی ہتھیار ـــــ علوم محض کتابی نہیں عملی علوم ـــــ وضع کرلے۔ ان علوم سے فطرت کی قوتیں انسان کی سورما پنے والی قوت کے قابو میں آجائیں اور موت کو روزافزوں کروڑوں پہلوؤں سے شکست یعنی مادّے کے ہر ذرّے میں جان کی روشنی اور حرکت پیدا ہوتی جائے۔

مستقبل کا علموں کا علم جنم شاستر ہوگا یہی وہ علم ہوگا جو سب سے پہلے اور سب سے آخری ہوگا اس علم کے بارے میں اس مضمون میں کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ اتنا یاد رکھنا چاہئیے کہ اس علم کی طرف عالی دماغ لوگوں کو ہمیشہ شغف رہا ہے اور اس جدید دور میں بھی اس جانب سوچ سمجھکر رجحان پیدا ہو چلا ہے۔ لیکن صدیاں ہی چاہئیں کہ لوگ جہالت اور دستور کی قیدوں سے آزاد ہو کر اس علم کی اصولی بنیاد رکھیں اور پھر مزید صدیوں کی ضرورت ہوگی کہ مادرانِ علم، یونیورسٹیاں۔ اپنے موجودہ غلط اور بیہودہ نصاب کو پس پشت ڈالیں اور اس جیتے جاگتے علم کو نصاب کی بنیاد قرار دیں اپنے لکچروں کے کمروں میں اس کو بار پانے دیں اور پروفیسر اور پڑھنے والے نوجوان بھی ایسے پیدا ہونے لگیں کہ تخلیقی آلات اور طریقوں اور اصول کو سمجھانے اور سمجھنے میں بڑھیوں ٹھیریوں کی طرح "ہا، گندی باتیں" نہ پکاریں اور نہ کنواری لڑکیوں کی طرح جھیپ جائیں۔

اس علم کے مدوّن ہونے اور رواج پانے پر یہ ایک لطیف عقدہ کھلے گا کہ عورت ذات بھی سورما پنے پن سے عاری نہیں اس کا بھی اس خصوص میں زبردست اثر ہے اور پیدائش میں صنف نازک غالباً شریک غالب ہے۔ چوٹی والیاں اور مونچھوں والے دوش بدوش موت اور زیست کی جنگ میں نبرد آزما ہونگے اور راقم کا خیال ہے کہ موت پر فتح کا سہرا زیادہ تر ان سورما پنے پن کی بھڑکانے ـــــ جان کی

پیٹ میں رکھوالی اور بے بس حیات کو دُودھ جیسا آبِ حیات پلانے والیوں ہی کے سر رہے۔ بہر حال یہ بھی بعد کی باتیں ہیں اُن کی صحبت کی کسوٹی آیندہ علمی اور نڈر تحقیق ہی ہو سکے گی۔

یہ علم تو خدا جانے کب معرضِ وجود میں آ سکے۔ البتہ علمی میدان میں سورما چنا بننے کے لیئے اَب بھی — یونیورسٹیوں کے باوجود۔ ایک دو تدبیریں پیش کی جا سکتی ہیں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دِل اور دَماغ سے خوف دُور کیا جائے۔ اس کی مشق اس طرح شروع کی جائے کہ جس علم — مثلاً اَدبیات — میں پروفیسروں اور نقادوں نے آپ کے دل میں جن جن بڑے ناموں کی عظمت بٹھا دی ہے اور جن کو اس بے معنی لفظ جی نی اس — سے تعبیر کر کے لوگوں کے دِل میں یہ بات بٹھانی چاہی ہے کہ بس اَب ان سے بڑھکر کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ ان ہی خدا داد طبیعتوں کی تجزیہ تنقید کیجیئے۔ اَن کے ہاں سے خرافات نکالیئے اور یہ یاد رکھیئے کہ کوئی طبع خداداد کسی علم کے دائرے میں بے عیب نہیں ہے ہر سونے میں کھوٹ اور ہر جواہر پاروں کے ڈھیر میں پتھر اور کنکر کا ہونا یقینی ہے۔ ہومر کی بزرگی کے گیت صدیوں سے گائے جاتے ہیں حالانکہ اس کا بیشتر حصہ مُردہ ہو چکا ہے خصوصاً اِی لی اُڈ کا وہ حصہ جہاں ہیکٹر کو اَکی لیز کے آگے دیکر قتل کرایا اور گھسٹوایا ہے۔ ہومر کا نہایت تکلیف دہ اور غیر شاعرانہ حصہ ہے۔ شیکسپیر کا بہت بڑا حصہ بے جان ہو چکا ہے۔ چیدہ چیدہ کھیلوں کے سوا اور ان میں سے بھی بہت مقامات کو حذف کر کے باقی بہت بڑا طومار صرف وہی دماغ پڑھ سکتے ہیں جن پر خواہ مخواہ شیکسپیر پرستی کا جنون پروفیسرو اور نقادوں کی گلفشانیوں نے سوار کر دیا ہے۔ میاں ملٹن کی "گم شدہ فردوس" کا جیتا حصہ صرف نکالا جائے تو غالب کے چھٹے چھٹائے دیوان سے بھی حجم میں زیادہ نہ نکلے اور ہمارے شعرا ماشاء اللہ بعض کے دیوانوں میں سے تو شاید صفر ہی

ایک جیتی جیتی چیز نکلے تو نکلے۔ بہرحال سورما پنے پن کی پہلی مشق یہ ہونی چاہیئے کہ ادبیات کے میدان میں جن بتوں کی پرستش کی جاتی ہے ان سے انکار کیا جائے۔ یہ اپنے ذہن میں عملی طور پر واضح کر لیا جائے کہ یہ جی نی اس والے یہ طبع خداداد والے بھی ہماری طرح انسان تھے اور ان کی چیزوں میں سب ہی چیزیں شہپارے نہیں ہیں۔

دوسری مشق یہ ہونی چاہیئے کہ عام طور پر ایک علم کے حلقے میں جو باتیں قطعی مان لی گئی ہیں اُن کے خلاف استدلال کیا جائے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ آپ ایسا ہی استدلال فراہم کر سکیں گے کہ ایک مسلمہ نظریہ کو توڑ ہی دیں۔ مقصد ذہنی ورزش سے ہے اور یہ بات آپ یاد رکھیں کہ اس دنیا کا کوئی نظریہ ابدی نہیں ہے ہر چیز میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ آج کے نظریئے کل والوں کے لیئے مذاق کے قابل ہوں گے۔ اس طرح کی ذہنی ورزش جیسے سورما پناپن آپ کی ہستی کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے گا۔ آپ کا مطالعہ محض کتابی اور حافظہ کی بن ہضم کی ہوئی غذا نہیں رہے گی بلکہ ہر چیز آپ کی ہو جائے گی اور اس طرح کی طبع آزمائی سے آپ کے دل میں جن نامور لوگوں ـــــ سورماپناؤں کا احترام احترام کی حد تک بیٹھ جائے گا وہ محض سنی سنائی قصیدہ خوانی اور اندھی پرستش نہیں ہوگی۔

اس دنیا میں اگر کوئی چیز قابل التفات ہے تو وہ بھی سورما پناپن ہے اور اس کا پالنا پوسنا اہم ترین فرض ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کو اس وقت اسکی بڑی ضرورت ہے کہ وہ اس اپنی سورما پنے والی امنگ کو روحانی ذہنی اور دستوری غلامیوں سے آزاد کریں۔ جب جوانی سینہ میں ایک دفعہ صحیح سائنٹی فک اسپرٹ ـــــ جو محض دوسرا نام ہے سورما پنے پن کا ـــــ جگا دے تو پھر اُس کو کبھی

دبنے نہ دیں۔ سورما چنا ہونا ایک رُوحانی کیفیت ہے اور جسم کے بڑھیا اور چہرے کے
جھریا جانے کا اثر اس پر مطلق نہیں ہوتا اگر اس کی صحیح طریقے سے رکھوالی کی جائے
یہ ممکن ہے کہ جسم پر بڑھاپے کا ٹھپہ لگنے کے بعد سورما چنا بھی گوشت پوست والی پیدائش
میں حصہ نہ لے سکے لیکن ذہنی اور روحانی تخلیق کی قوت صرف کم ہی نہیں ہو سکتی
بلکہ اس میں اور اضافہ ہو سکتا ہے۔

یہ ہے سورما چناپن اور تعلیم کا زبردست مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ سورما چنے پیدا کیے
جائیں۔ ایسے نوجوان تیار کئے جائیں جو جوان ہونے کے بعد پھر کبھی کم از کم ذہناً بڈھے
نہ ہوں جن کے سورما چنے پن سے ایک طرف بھوجی کی جان کی پونجی میں فراوانی ہو
اور دوسری طرف فطرت کی تمام قوتیں انسان کی لونڈی بنتی جائیں۔ موت انسان
کے اصلی دشمن کو شکست فاش ہو اور زمین کا بوجھل مرگ بسا مادہ جان اور روح کی
گرمی سے لطیف ہو کر کائنات کے جسد میں سرایت کر جائے انسان از سرتا پا نور ہو کر
کسی ایک تاریک یا جھلملاتے تارے کا پابند نہ رہے بلکہ کل تماشا گاہ کائنات اس کی
جولانگاہ ہو جائے۔ بے گنتی سورجوں کی کرنیں اس کے سیر و تفریح کی شاہرائیں
ہو جائیں۔ ستاروں اور ان کے نظامات کی چال ڈھال، کائناتی قوتوں کا زور شور
اس کے لئے ناچ گانا ہو، نئے نئے عالموں کے بننے اور سنورنے میں اس کو دخل ہو
اور کائنات کی عظیم ترین روح اس کا ملجا اور مامن، اس کی مسرت اور شادمانی کا لامتناہی
سرچشمہ ہو۔

بھیڑیا چال

یہ اُردو اَدب سے متعلق مضمون ہے لیکن لگے ہاتھوں معاشیات
اور عمرانیات کے مسائل کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ قدامت پرستی کے تار
و پود بکھیرتے ہوئے بتایا ہے کہ طرح طرح کے بھیس میں رُوحانی۔
ذہنی اور نفسیاتی بھیڑیا چال سماج کی رُوح رواں ہے اور یہ کہ
اَدب میں بھیڑیا چال کو اختیار کرنے سے نئی راہیں نہیں نکل سکتیں
پھر اسی ضمن میں لکھا ہے کہ اَدب میں نئے خیالات کے یہ معنی ہیں
کہ نئے الفاظ کی نئی ترکیبیں زبان میں اپنے آپ حلول کرنے لگتی ہیں
اور جو لوگ زبان کو اپنانے اور زبان میں عمدہ خیالات ادا کرنے پر
قادر ہو جاتے ہیں وہ ایک دن خود اہلِ زبان کا لقب حاصل کر لیتے
ہیں۔

فاضل اَدیب نے وہی باتیں لکھی ہیں جن پر خود عمل کیا ہے۔
چنانچہ اُنھوں نے اَدب اور شاعری میں نئی راہیں نکالیں۔ نئی
چالیں نئی ترکیبیں نئے طرزِ ادا اور نئے اَسلوب پیدا کیے اور پھر
بہت سے اولوالعزم اہلِ قلم اسی راستہ پر بھیڑیا چال چلنے لگے

اب آپ خود مضمون پڑھکر زبان کے توپح۔ نئے اسلوب بیان
نئی ترکیبوں اور عبارت کی شستگی اور پاکیزگی کا لطف اٹھایئے
بات یہ ہے کہ سیاسیات۔ عمرانیات اور معاشیات وغیرہ کے دقیق مسائل
کو جس طرح روزمرہ اور عام فہم بنانے میں نادر الکلامی دکھائی ہے اس پر
عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ میں جب معصومیت کی زندہ مثال ٹٹولتا ہوں تو اس وقت
میرے دل میں بھیڑ بیچاری کا تصور آجاتا ہے۔ اس کی معصومیت اپنا جواب نہیں
رکھتی۔

اس کے پاس ایذارسانی کا اول تو کوئی ہتھیار ہی نہیں اور اگر کسی عضو
سے یہ اس قسم کا کام لے بھی سکتی ہے تو بیچاری میں طبعاً اس بات کی صلاحیت
ہی نہیں۔ عملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ جارحانہ اعضا اس بیچاری کو دیئے ہی نہیں گئے۔
اور اس قسم کے فطری ہتھیاروں کے فقدان کا نتیجہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ بھیڑ بیچاری
کسی کو ایذا نہیں پہونچا سکتی بلکہ بڑی مصیبت یہ آپڑی ہے کہ یہ اپنے بچاؤ کی بھی
استعداد نہیں رکھتی۔

اس غریب غیر ایذارسان ہستی کا بڑا مقصد زندگی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوروں
کے کام آئے۔ اس کی جان اسی لیئے ہے کہ دوسروں کا تن تازہ کرے اس میں
شک نہیں کہ اور جاندار بھی اس خوبی میں بھیڑ کے شریک حال ہیں لیکن بھیڑ کی
سی بات کہاں ؟ بھیڑ کا سا ایثار چراغ لیکر ڈھونڈھیں تو بھی نہ ملے۔ انتہا ہے کہ
یہ اسی ہاتھ کو پیار اور لجاجت سے چاٹتی ہے جو اس کو حلال کرنے والا ہے۔
صرف یہیں اس کی نیکیاں ختم نہیں ہوتیں بھیڑ کی ایک صفت ایسی قیمتی ہے کہ

انسان نے خصوصیت کے ساتھ اس کو خود اختیار کیا ہے کاش انسان بھیڑ کی ستودہ صفات میں سے غیر ایذا رسانی یا ایثار کے محاسن کو اختیار کرتا! انسان نے بھیڑ کی جس خوبی کو اپنے لیئے چنا ہے وہ یہ ہے کہ بھیڑ اجماع کے خلاف کبھی قدم نہیں اُٹھاتی جہاں اپنے میں سے ایک کو ایک رُخ جاتے دیکھا اور بس یہ آنکھیں کھولے مگر اندھوں کی طرح اس طرف ہولی، یہ ایک ایسی ممتاز اور روشن صفت ہے اور اس قدر افراط سے کوٹ کوٹ کر بھیڑ کی طینت میں بھری گئی ہے کہ ہماری اُردو میں کسی گمنام اصطلاح ساز نے اس صفت کا نام ہی "بھیڑیا چال" رکھدیا اور اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان کے ایک زبردست رجحان کو دو لفظوں میں آئینہ کر دیا ہے ایک ناپیداکنار سمندر کو کوزے میں بند کیا۔ انسان کی زندگی کا کون سا شعبہ کونسا رُخ ہے جہاں اس چال کی گرانبار برکتیں نہیں پائی جاتیں۔ طرح طرح کے بھیس میں روحانی ذہنی اور نفسیاتی بھیڑیا چال سماج کی روح رَوان ہے ارتقائے انسانی میں شاید بھیڑ کی چال نے سب سے زیادہ اہم حصہ لیا ہے۔ سماج باقی ہی نہ رہے اگر انسان اس چال کو چھوڑ دے یہ ہے خیال بڑے بڑے لوگوں کا جو انسانی تمدن کے قطب تارے سمجھے جاتے ہیں اور بھیڑیا چال میں کمال رکھتے ہیں۔

خال خال ایسے بھی انسان نکل آتے ہیں جو اِس چال سے گریز کرتے ہیں جب ایسا انسان نمودار ہوتا ہے اور نئی چال چلتا ہے تو عجیب تماشا ہوتا ہے وہ سوتی بھیڑ کو جگا دیتا ہے۔ سلسلہ کلام قطع تو ہوتا ہے لیکن بھیڑ کی وہ صفت بھی جو سوتے سے بیدار ہو جانے پر ظاہر ہوتی ہے ایک اور لطیف شئے ہے اور نہایت اہم۔ اس لیئے کہ انسان نے بھیڑ کی اس صفت کو بھی اختیار کرنے کی عزت بخشی ہے۔ جوں جوں جمہوریت پھیلتی جاتی ہے یہ سوتی بھیڑ والی خوبی سماج کا ایک لطیف اور دلچسپ مشغلہ ہو جاتی ہے بہت سے لوگ اس کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ ایک

ایسی سماج میں جہاں لوگ جمہوریت کے ڈھرّے پر بھیڑ کی چال چلنے لگے ہوں کوئی نہ کوئی سماجی یا سیاسی اُدبی علمی وغیرہ وغیرہ بات ایسی نکل ہی آتی ہے کہ سماج کے کسی ایک طبقہ کو سوتی بھیڑ کی طرح جگا دے اور پھر کیا پوچھنا ہے۔ مدیروں کے کمروں مقرروں کے چبوتروں اور گھروں کے دیوانخانوں سے سوتے سے جگائی ہوئی بھیڑ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

جو انسان بھیڑیا چال کو چھوڑنے کی جسارت کرتے ہیں وہ سوتی بھیڑ کو جگا دیتے ہیں۔ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیتے ہیں۔ لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ بھیڑیا چال سے یہ الگ ہونے والے ہی اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ لوگ بھیڑوں کی طرح ان کی چال چلیں۔ اگر ان نئی چال والوں کی چل گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ چند لوگ ان کے راستہ پر بھیڑیا چال چلنے لگے۔

دنیا میں ایسے بھی اللہ کے بندے موجود ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ وہ انسان جو نئی راہیں نکالیں دنیا کے بڑے لوگ ہیں اور جسے ترقی کہا جاتا ہے وہ اُنہیں کے دم قدم سے دنیا میں ظاہر ہوتی ہے، یہ لوگ دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی تعداد کی کمی میں بھی بڑی حکمت ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر ان کی تعداد میں ہندوستانی گریجویٹوں کی طرح زیادتی ہو جانے تو پھر ان کی قدر و قیمت ہی کیا رہے؟ اور بڑا خدا کا شکر ہے کہ جن کو ماں کے پیٹ سے نئی چال ایجاد کرنے کا لپکا نہ عطا ہوا ہو وہ خواہ ہندوستانی خواہ انگلستانی یونیورسٹیوں میں عمر بھر ہی تعلیم کیوں نہ پائیں اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کریں کوئی نئی چال اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتے۔ دوسری حکمت کی بات یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر ان لوگوں کی کثرت ہو جائے تو پھر سماج کا اللہ ہی حافظ ہے۔ آئے دن کی نئی چالیں سماج کے شیرازے کی دھجیاں بکھیر دیں سکون خاطر امن و امان کہیں دنیا بھر میں ڈھونڈے نہ ملے۔ علاوہ اس کے یہ بھی

ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ نئی چال والے دماغوں کے بھی مدارج ہیں۔ ان میں سے بعض
تو واقعی زبردست سورج ہوتے ہیں جن کے گرد سیاروں کا ایک نظام قایم ہوجاتا ہے
دوسرے سرے پر بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی بھیڑیا چال میں ایک انوکھا پن
ضرور رہتا ہے گو کبھی اتنی جرات سے کام نہیں لیتے کہ کوئی نیا پتیرا کاٹ جائیں
اور دنیا کو نئی چال کا تماشا دکھا دیں۔ ان دو سروں کے بیچ میں کئی طرح کے نئی
چال والے، آپ کو نظر آئیں گے۔ ان میں ایک قسم نہایت ہمدردی کے قابل
ہوتی ہے۔ اِس قسم کے لوگ اپنی ایک نئی چال رکھتے ہیں اور گو سماج اُن کو کتنا
ہی نکّو بنائے اور ان کی ہنسی اڑائے وہ اپنی انوکھی چال سے بال برابر نہیں
ہٹتے لیکن اُس کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ لوگوں کے بھیڑیا چال کے فطری
رجحان کو اپنی چال کی جانب مائل کرلیں۔

بہرحال بھیڑیا چال انسانی فطرت کی ایک زبردست کیفیت ہے اور انسانی
ارتقاء کا ایک بڑا راز ہے۔ ہر سماج میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ نئی
ہونہار پود کو اپنی اپنی چاہتی من بھاتی روشوں پر بھیڑوں کی طرح چلنا سکھایا جائے
پہلے تو گھر کی آب و ہوا اس رجحان کو راسخ کردیتی ہے اور مدرسہ میں بھی مارپیٹ
اور گھیر گھار کر بچے مقررہ لکیروں کے فقیر اور بھیڑیا چال میں طاق بنائے
جاتے ہیں۔

ایک میرے عزیز دوست تھے جن کو یہ خبط تھا کہ نئی نئی باتیں پیدا کی جائیں
اِس خبط نے یہاں تک اُن پر تصرف کرلیا تھا کہ وہ ہر پرانی چال کو بُرا سمجھتے تھے
نئی پود کو پڑھانے کا ان کو بڑا شوق تھا اس لیئے کہ ان میں سے ہی اُن کو آگے
چلکر ایسے "مرید" مل سکتے تھے جو ان کے خیالات کے مطابق بھیڑیا چال چلیں۔
ایک دن چنانچہ خاصے بڑے لڑکوں کو کچھ سمجھا رہے تھے اثنائے تقریر میں اپنے

حسب عادت خبط کے مطابق فرمانے لگے۔

"بزرگ ۔ بزرگ ۔ بزرگی ایک بے معنی لفظ ہے ۔ اسلاف پرستی نے کل ایشیا اور خصوصاً مسلمانوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ عالمگیری دور کے بعد سے جو مسلمانوں کی حکومت مٹنے لگی، اسلامی حکومت کو گھن سا لگ گیا یہ انہی لوگوں کی بدولت تھا جن کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں اور ان کی جہالت اور کرتوتوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سر پر ولایتی بوٹ بج رہا ہے۔ ان بزرگوں کی شان میں سوائے اسکے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ بس کہنے کو تو بزرگ تھے . . . ." اپنے خبط کے جوش میں کہنے کو تو کہہ گئے اور اس میں شک نہیں کہ لڑکوں پر ان کی منطق کا رعب بھی بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن لڑکوں کی بھیڑیا چال جو گھر میں اور صحبت میں دوسرے ڈھرے پر پڑ چکی تھی وہ کب آسانی سے دب سکتی تھی۔ ایک لڑکے نے کاغذ کے پرزے پر اسی وقت یہ شعر لکھکر ان کے ملاحظہ میں پیش کیا ؎

بزرگش نہ خوانند اہل خرد

کہ نام بزرگان بہ زشتی برد

اُس کو دیکھ کر بھنائے تو بہت مگر تھے منطقی پہلوان اور اپنے خبط کی دُھن میں یہ نہیں کیا تھا کہ پرانی کتابوں کا مطالعہ نہ کرتے اسی شعر کے نیچے لکھدیا۔

بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

بھیڑیا چال کی ظاہری صورت تو یہ ہے کہ جدھر ایک یا بہت کو قدم اُٹھاتے دیکھا اُسی طرف اپنے بھی قدم اُٹھنے لگے یہ بہت ہی ابتدائی بن منجھی اور اَدھکچری سی صورت ہے ۔ انسانی دنیا میں یہ بھی پائی جاتی ہے اور افسوس ہے کہ بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک اس سطحی بھیڑیا چال کی زیادتی انسان کے صاحب عقل ہونے پر دال نہیں۔ بعض صاحب الرائے اس پر زور دیتے ہیں کہ

یہی بات تو انسان کی تمدنی ارتقا کی جان ہے انسان طبعاً ریوڑ پسند پیدا کیا گیا ہے تاکہ سماجی اور سیاسی ترقی کرے بہرحال یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ آدم زاد ظاہری بھیڑیا چال کی کثرت سے چلتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے ملنے جلنے پہننے اوڑھنے غرض ہر حرکت میں یہ چال موجود ہے۔ اِک زمانہ تھا جس کی تصویر مولانا نذیر احمد نے 'ابن الوقت' میں کھینچی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی ٹوپی پہننا تک حرام تھا اور کوٹ پتلون۔ سگرٹ سگار تو کبیرہ گناہ تھے۔ ان کے بعد ایک دور آیا کہ نرا رخساروں کا صفایا ہی نہیں بلکہ چار اَبرو کی صفائی بھی اُوپری بات نہیں رہی۔ انگریزی فیشن پوری طرح سوار ہو گیا۔ بیچارے پرانی بھیڑیا چال والے جو 'ابن الوقت' کے زمانہ میں سوتی بھیڑ کی طرح جاگ اٹھے تھے دم بخود ہو کے رہ گئے۔ خود ان کے سعادتمند فرزند بوٹ کی چرچر۔ سگار کی خوشبو۔ پھنسی ہوئی شکن دار پتلون پر اکڑنے لگے اور ان کی صاحبزادیاں اسی وضع کے دولہاؤں کی کم از کم معاشی پہلو سے آرزومند ہونے لگیں۔ آوا کا آوا ہی بگڑ جائے تو کوئی کمبخت کیا خاک اصلاح کرے۔ پھر ایک دور آیا۔ جس میں قارئینِ کرام اور راقم پڑھنے اور لکھنے میں گرفتار ہیں کہ ولایت کی آب وہوا میں منڈے ہوئے رخساروں پر ڈاڑھیاں بلا روک ٹوک اُگنے لگیں کوٹ پتلون نظروں سے گر چلے۔ اِس میں شک نہیں کہ کھدر کے معاشی سیاسی جوش نے مغرب کی دلفریبیوں کے طلسم کو توڑ دیا یہ اور بات ہے کہ بعض ہستیوں نے کھدر تو اختیار کر لی لیکن اس کے کوٹ پتلون ضرور بنوائے۔ ایسے افراد چشم پوشی کے قابل ہیں اس لیئے کہ جس چال کی عادت پڑی ہوئی ہو وہ جاتے جاتے ہی جاتی ہے۔

اس نئی اٹوائی کھٹوائی والی بھیڑیا چال سے بہت سے فائدے ہوئے گو آج کل اس چال کی بری گت ہے مگر دنیا میں کوئی شئے مفاد سے خالی نہیں

"خواہ وہ مفاد ذاتی ہو یا قومی۔ ہاں تو اس چال، مہاتما والی چال سے ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ بہت سے فائدے ہوئے ایک تو بڑا فائدہ مثلاً یہی ہے کہ دِلّی کے جوتے انگریزی بوٹ شوز کے آگے جی سے اُتر گئے تھے سلیم شاہی اور کیمخت کے جوڑوں کی مانگ بہت ہی کم ہو چلی تھی کہ اِس نئی چال نے اِن جوتوں کی قسمت جگا دی اور یہ بڑے بڑے لیڈروں کے قدموں تک پہنچ گئے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانی یوں دیکھنے میں تو پُرانی بھیڑیا چال کے گرویدہ بن گئے لیکن حقیقت میں انگریزوں کی حریّت والی چال اختیار کرلی۔ اور اس میں لطیفہ کی بات یہ رہی کہ یورپ کی آزادانہ سیاسی روش پر بھیڑ بکری کی طرح پڑ لیے لیکن کشتی نما کھدر کی ٹوپی کھدر کے انگرکھے اور دِلّی کے کامدار جوتوں نے اس ذہنی بھیڑیا چال کو ایسا چھپایا کہ بڑے بڑے لوگ بھی اس دھوکے میں آگئے کہ ہم نے یورپ کے پیچھے بھیڑیا چال چلنی ترک کردی ہے!

غرض ان مثالوں سے اصل مدعا یہ تھا کہ ظاہری اور سطحی باتوں میں بھیڑیا چال اس میں شک نہیں کہ آدمیوں میں بہت پائی جاتی ہے اور اس کا نام بزرگوں کا دستور، وضعداری، فیشن اور رواج رکھا جاتا ہے لیکن بھیڑیا چال کی اعلیٰ ارتقاء یہ ہے کہ ظاہر اور سطح تک ہی محدود نہ رہے بلکہ باطن اور رُوح پر بھی چھا جائے۔

باطنی بھیڑیا چال کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سماج کے لوگوں کے دماغ ایک ہی ڈھرے پر سوچنے لگتے ہیں۔ اپنے آپ شخص اپنے بل پر سوچنا دنیا میں سب سے کٹھن کام ہے جتنی تکان اِس طرح سوچنے میں دم بھر میں ہوتی ہے وہ دن بھر تھپیڑ ڈھونے میں نہیں ہوتی۔ بھیڑیا چال کے فطری لپکے کا بھلا ہو کہ اس کی بدولت آدمی مشین کی طرح اوروں کے خیالات سوچنے لگتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک سماج میں اسلاف پرستی نے خوب ترقی کی ہے۔ ایسی

سماج میں سوچ اور استدلال کی ساری محنت یہیں تک ہوتی ہے کہ کسی بزرگ کے قول یا فعل کی تائید ڈھونڈھ نکالی جائے۔

آغائی بیگم کی لڑکی کی چوتھی تھی۔ چوتھی کی رسم کے لئے دُلھن کی خالہ کوٹھری میں سے دُلھن کو گود میں لائیں۔ کھڑی ہیں اور بحث یہ ہو رہی ہے کہ دُلھن کو مسند پر قبلہ رُو بٹھایا جائے یا نہیں۔

ایک بیوی بولیں "لو بی دلھن کی خالہ کو دیکھو اتنی بھی خبر نہیں۔"

دوسری نے آوازہ پھینکا "اے ہے بوا! بڑھیا ہونے کو آئیں اور اتنی نہیں جانتیں کہ دُلھن قبلہ رو بیٹھے گی اور دُولھا سامنے تو دولھا کی پیٹھ قبلہ کی طرف ہوگی۔"

دلھن کی خالہ بولیں "اے ہے۔ یہ تو سب بیٹھی مزے سے باتیں بنا رہی ہیں ہمارا کولھا ہے کہ ٹوٹا جاتا ہے ہم نہیں جانتے خیر کوئی نیک بخت بتائے دُلھن کو کس رُخ بٹھایا جائے۔"

دُلھن کی اماں نے پکارا "اری سلطانی! کیا کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ ذرا خالہ سیدانی کو بلا لا وہ ابھی بتا دیں گی۔"

خالہ سیدانی گردن ہلاتیں لکڑی ٹیکتیں اپنی اہمیت جتاتیں آئیں "اے ہے! اب بڑے بوڑھوں کی کون سنتا ہے۔ پھر بھی وقت پر ہم ہی کام آتے ہیں۔ ارے لوگو! آخر کیا بات پوچھنی ہے۔ بس اتنی ہی بات تھی! یہ کون بڑی بات ہے؟ آغائی بیگم تمہاری اماں۔ خدا جنت نصیب کرے۔ مجھ سے پوچھے بغیر کوئی بات نہیں کرتی تھیں۔ ہم نے مولویوں کے گھرانوں کی شادیاں دیکھی ہیں دُولھا دُلھن کو برابر برابر قبلہ رُو بٹھاتے ہیں۔"

بعینہ اسی طرح مردوں کی سیاسی معاشی اور سماجی دنیا میں بیشتر گتھیاں

سلجھائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہیں اس بھیڑیا چال کا احساس مشکل ہے لیکن غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں یہی ساری دُنیا کو چلا رہی ہے۔ اس چال کی برکتوں پر اور اس کے لطیف مطالعہ میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اِس ذرا سے مضمون میں اس کا محض سرسری مطالعہ منظور ہے اور وہ بھی صرف اُردو ادب کی حد تک۔ مذہبی سیاسی اور سماجی دائروں میں اس چال کا مطالعہ نہایت آنکھیں کھولنے والا ہے مگر اس مضمون کو ان چیزوں سے سروکار نہیں۔

اَدب میں ذہنی بھیڑیا چال کے نہایت لطیف نمونے ملتے ہیں کسی زبان کی اَدبی تاریخ پر نظر ڈالیے اُس میں آپ یہی پائیں گے کہ بھیڑیا چال چھائی ہوئی ہے بعض عہد ایسے ملیں گے جہاں نئی نئی چالیں نمودار ہوئی ہیں۔ اِن نئی چالوں کی مسلمہ بھیڑیا چال یا تو ایسی روک تھام کر دیتی ہے کہ وہ چلنے نہیں پاتیں یا یہ ہوتا ہے کہ پرانی چال کو چھوڑ کر لوگ نئی چالوں پر اکڑنے لگتے ہیں اور پھر کسی اور نئی چال کے روادار نہیں رہتے۔

اَدب کے بھی انسان کی طرح دَو رُخ ہیں۔ ایک ظاہر اور ایک باطن۔ ظاہر کا تعلق الفاظ سے ہے۔ اور باطن کا معانی سے ہے۔ اور اس طرح اَدب میں بھی بھیڑیا چال محض سطحی بھی ہوتی ہے اور گہری بھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ گہری بھیڑیا چال زیادہ زبردست ہوتی ہے یا یوں لکھنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ بھیڑیا چال کا باطنی پہلو ہی اصل چیز ہوتا ہے۔ بہرحال اَدب کے باطنی رُخ میں جو بھیڑیا چال قائم ہوتی ہے اُسکے پیرو اس بات کے دعویدار ہوتے ہیں کہ ملکاتِ معانی میں بھی ہمارے پیشرو بزرگ جن کے نقشِ قدم پر ہم اَدب اور احترام سے چل رہے ہیں اِس قدر کام کر گئے ہیں کہ اب کسی نئے خیال کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اُنہوں نے یعنی بزرگوں نے جو کچھ تحقیقات کی اور جو جو خیالات اُنہوں نے اپنے بے نظیر دماغوں سے غور و فکر

کر کے نکالے اس زمانہ کے کمزور دماغوں میں سے اب کسی کی مجال نہیں کہ اُن خیالات میں اپنی بیہودہ جدتوں سے کوئی اضافہ کر سکے۔ لیکن نئی چال والے اسی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں کہ عالمِ خیال میں نئے خیالات کے اضافہ کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس بات کو نہیں مانتے کہ مملکت ادب کو پرانے لوگوں نے پوری طرح چھان مارا ہے یا یہ کہ اس مملکت میں اور نئے مقبوضات کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ جو نئی چال ایسی ہوتی ہے کہ مملکتِ معانی، میں جدت اور ہیجان پیدا کر دے وہ ایک خطرناک انقلاب کا منبع بن جاتی ہے۔ اور اگر ایسی نئی چال والے ادبی دنیا میں واقعی نئے اور کار آمد خیالات کا سیلاب اپنے ساتھ لاتے ہیں تو ایک دن اُن کو ضرور جیت ہو جاتی ہے۔ بہت سے پرانی چال والے کھلم کھلا یا ہچکچاتے ہوئے نئی چال سیکھتے جاتے ہیں اور نئی پود پر تو نئی چال کا جادو آسانی سے چل جاتا ہے۔ نئے خیالات کے یہ معنی ہیں کہ نئے الفاظ کی نئی ترکیبیں زبان میں اپنے آپ حلول کرنے لگتی ہیں۔ اس طرح گہری یعنی معنوی حیثیت سے ادبی بھیڑیا چال اور رنگ ڈھنگ اختیار کرنے لگتی ہے تو سطحی یعنی لفظی بھیڑیا چال کا بھی رنگ بدلنے لگتا ہے۔ دراصل نئی اور پرانی چالوں کی پہلی لڑائی سطح پر یا یوں کہئیے لفظی دنیا میں ہوتی ہے۔ ہمارا مطالعہ جیسا کہ کہیں عرض کیا گیا ہے سرسری ہے اور زیادہ تر سطحی بھیڑیا چال سے متعلق رہیگا۔ کیونکہ باطنی رُخ والی چال کے مطالعہ میں ایسی موشگافیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ خالص نفسیات کے بھنور میں جا پڑنے کا ڈر ہوتا ہے۔

ادب میں سطحی بھیڑیا چال ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ الفاظ محاورات اور ترکیبوں میں پیشرو بزرگوں اور مسلمہ اُستادوں کی تتبع ناگزیر ہے لیکن اس واضح اُصول پر خود بھیڑیا چال والے اس طرح عمل پیرا ہوئے ہیں کہ

اِس سے نئی چال والوں کو اعتراض کا موقع ملتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پرانی
بھیڑ یا چال والے اصحاب کے زرہ بکتر میں ان کا عمل ہی خود دکھڑی دری کا زبردست
نقطہ ہے۔ یہ مان لیا جائے کہ پرانے مسلمہ اُستادوں کی پیروی کی جائے لیکن
زبان کی ابتداء سے اب تک بہت سے بعید اور قریب مسلمہ اُستاد گذرے
ہیں۔ ان سب کی تتبع ہر حالت میں درست نہیں۔ مثلاً اُردو کی ابتدا میں ایک
دَور ایسا گذرا ہے کہ "سے" کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جن بزرگوں اور مسلمہ
اُستادوں نے اس کا استعمال نہیں کیا ہے ان کی تتبع آج کل "سے" کی حد تک
مستحسن نہیں۔ اِس لئے کہ اس طریقہ کو بعد کے بزرگوں اور مسلمہ اُستادوں کے
ہاں متروک کر دیا گیا ہے۔ اس زمانہ کے اُردو لکھنے اور بولنے والے کس زمانہ
تک کے بزرگوں اور مسلمہ اُستادوں کی روش پر چلیں۔ یہ بھیڑ یا چال کی سرحد اور
تعین ان کا مسئلہ واضح اور منطقی طور پر کبھی حل ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ ہر شخص اپنے
مذاق کے مطابق بعض الفاظ یا محاورات کو ٹکسال باہر قرار دے لیتا ہے اور
اُس پر بڑی بڑی طولانی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں مزہ کی بات تو یہ ہے کہ ہر شخص کا
ذوقِ سلیم چند الفاظ اور محاورات کے لحاظ سے بہت دور کے مسلمہ اُستادوں
تک پہنچتا ہے تو بعض الفاظ اور محاوروں کے بارے میں اپنے ہمعصر اُستادوں
کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اور اس قسم کی حیث بحث بحاورہ بیگمات رہتی دنیا
تک یوں ہی رہیگی۔

آجکل نئی چال والے لوگوں کا خیال ہے اُردو میں جدید علوم کی ضرورت
ہے اور نئے علوم کو اُردو میں جلوہ گر کرنے کے لئے اصطلاحیں گھڑنی ضروری
ہیں۔ بغیر اصطلاحات کے وضع ہوئے ان علوم کا زبان اُردو کے قالب میں
آنا ممکن ہی نہیں۔ جن لوگوں نے اس اٹل ضرورت کے دباؤ سے اصطلاحیں

بنائیں اُن کو پُرانی بھیڑیا چال والوں نے بنانا شروع کیا اور اپنی خاص محفلوں میں اِن اُوپری چیزوں پر خوب ہنسی اُڑائی جا رہی ہے۔ ابھی اُردو میں جدید علوم کا آنا مدتوں کی بات ہے اور اِس مدت میں جدید علوم میں اس قدر ترقی دن دونی اور رات چوگنی ہوتی جائیگی کہ وہ پُرانی اِصطلاحیں جن کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہوگا بیشتر متروک اور بہت سی تازی اِصطلاحیں پیدا ہوتی جائیں گی۔ لہٰذا اِس کی توقع نہیں کہ اُردو بولنے والی دُنیا کو کرۂ اَرض کے وجود تک اِس مزیدار بحث سے بھی کبھی نجات ملے۔

ایک دفعہ ایک پُرانی بھیڑیا چال والے بزرگ کی ایک نئی چال والے نوجوان سے کسی محفل میں مڈھ بھیڑ ہو گئی اِن کی دلچسپ باتیں جتنی حافظہ میں محفوظ رہیں وہ نذرِ ناظرین ہیں۔

پُرانی بھیڑیا چال: "بھئی! معلوم نہیں آپ لوگ اُردو کو جینے بھی دینگے یا نہیں؟ عجیب عجیب لفظ تراشے جاتے ہیں جن کا کوئی سر نہ پیر۔ بھلا ہیڈ روجن کے ترجمہ کی ہی کیا ضرورت تھی؟ کل کیا دیکھتا ہوں ایک صاحب نے اِس کا ترجمہ کیا ہے 'مائین'۔ میں حیران تھا کہ مائیں کیسی اور یہ مائیں۔ (ماں کی جمع) کیسے آ گئیں، یہ لوگ نہ عربی جانیں نہ فارسی، اپنی زبان اُردو کی حقیقت سے بے خبر معمولی بول چال کر لینی اُردو نہیں۔ دِلّی اور لکھنؤ کی مہترانیاں بھی ٹھیک اُردو بول لیتی ہیں۔ اُردو کا آنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔"

نئی بھیڑیا چال: "عجب مشکل ہے! اگر آپ لوگوں کے کہنے پر چلا جائے تو پھر اُردو میں جدید علوم کس طرح آئیں گے۔ اور جب تک اِن علوم سے اُردو مالامال نہ ہو وہ ترقی کس طرح کرے گی۔ آپ حضرات زبان کے حق میں جسے دوستی سمجھتے ہیں وہ دراصل اُس کے حق میں کانٹے بونا ہے۔"

پ۔ بھ۔ ح۔ "آپ لوگ ذراسی انگریزی پڑھ کے ایک تو انگریزی سے
مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگتے ہیں۔
سچی بات تو ایسی کڑوی لگتی ہے کہ بس آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ غرور کی یہ
حالت کہ انگریزی کیا پڑھ لی اَب گویا جو انگریزی نہیں جانتا وہ آپ کی نظروں میں
کچھ جانتا ہی نہیں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ کون سے علوم ہیں جو عربی میں نہیں۔
عربی اپنی دینی زبان ہے۔ اس سے اِصطلاحیں لیجئے مگر رونا تو یہ ہے کہ عربی
کوئی جانے نا تب؟ ....

ن۔ بھ۔ ح۔ "قبلہ اِس وقت اُردو سے بحث ہے۔ آپ عربی کی اِصطلاحیں
جوں کی توں اُردو میں نہیں لے سکتے اور پھر عربی میں جدید علوم، کہاں؟ وہاں
خود فرانسیسی اِصطلاحات کو عربایا جاتا ہے۔ یا اصطلاحیں گھڑنی پڑتی ہیں۔

پ۔ بھ۔ چ۔ "عربی دانی معلوم ہوئی؟ خیر اِسے ہم مانے لیتے ہیں کہ ایک
آدھ جدید علم ایسا جس کی اِصطلاحیں عربی میں نہیں۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ اِس
علم کے لئے اُردو میں اِصطلاحیں تراشنی کیا ضرور ہیں؟ ارے بھئی اِس علم کو
پڑھنا ہے زبان انگریزی میں پڑھ لیجئے آخر آپ کی انگریزی دانی کس دن کام
آئے گی؟ چلئے چھٹی ہوئی۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ترجمہ کی خاطر خاصی بھلی چنگی زبان
کی ٹانگ توڑی جائے۔"

ن۔ بھ۔ چ۔ "انگریزی اسی لئے پڑھی ہے کہ جدید علوم پڑھے جائیں
اور جدید علوم اس لئے پڑھے جائیں کہ اپنی زبان کو ان علوم سے متمول کریں ورنہ
انگریزی پہ وقت صرف کرنا تضیع اوقات ہے۔"

پ۔ بھ۔ ح۔ "میں یہ پوچھتا ہوں کہ 'جدید علوم' 'جدید علوم' جو آپ پکارتے
ہیں اُن سے کیا مطلب؟ یہی نا کہ اِنجن بنایا جائے موٹر چلائی جائے اوّل تو یہ کوئی

ضروری علوم نہیں بھئی! انگریز اِس کام کو کرتے ہیں کرنے دو۔ اُن کو اِن چیزوں کا شوق ہے ہم اپنے علوم کو چھوڑ کر اس طرف کیوں دوڑیں۔ اچھا یہ بھی جانے دیجئے آپ نے "جدید علوم" سیکھ کر کاٹھ کی ہی ایک موٹر بنائی؟ زبان میں ان علوم کے ترجمہ سے زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ آپ ایک جھوٹ موٹ کا ہی انجن گھڑ لیتے"

ن۔ بھ۔ چ "ہاں ہاں! موٹریں بھی بنیں گی اور انجن بھی۔ پہلے یہ علوم تو زبان میں عام طور پر رواج پا جائیں۔ لوگوں کے دماغ اِس طرف متوجہ ہو جائیں پھر سب کچھ اپنے آپ ہو رہیگا"

پ۔ بھ۔ چ "پرانی تعلیم کے لوگوں پر آپ حضرات کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ نری باتیں بناتے ہیں! اچھا صاحب ہم تو باتیں ہی بناتے ہیں! آپ کو دیکھا تو آپ بھی نری باتیں بگھارتے ہیں۔ الفاظ گھڑتے ہیں اصطلاحیں تراشتے ہیں۔ رہا یہ کہ کوئی کام کی بات ہو سو کچھ بھی نہیں۔ وہی لفظوں کے ہیر پھیر میں آپ بھی گرفتار ہیں"

ن۔ بھ۔ چ "یہ آپ ہی بزرگوں کی بدولت ہے کہ ہم کو لفظوں سے کھیلنا پڑا ہے۔ اگر پرانے لوگ علوم کی جانب مائل ہوتے اور نرے معقولات منقولات اور واہیات کے تودوں میں اپنی عزیز عمریں نہ گنواتے تو آج ہمیں یہ مصیبت کیوں اُٹھانی پڑتی"

پ۔ بھ۔ چ "لیجئے اب آپ تھوڑی دیر میں لام کاف پر اُتر آئیں گے"

ن۔ بھ۔ چ "سچی بات کب بھلی لگتی ہے۔ آپ ہی کے قول سے بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اب آپ اِس بات کو چاہے گالی گلوچ کہئے چاہے لام کاف"

پ۔ بھ۔ چ "آپ اِس حال سے کب خالی ہیں! میں کہتا ہوں ہماری

پتہ کی باتیں آپ پر منطبق گذرتی ہیں جواب بن نہیں پڑتا تو بگڑنے لگتے ہیں۔۔۔۔۔۔،

غرض یہ حجت لا تمنا ہی ہے اور بعض صورتوں میں زبانی اور قلمی سے گذر کر لاٹھی کے استدلال تک پہونچ سکتی ہے۔ لاٹھی کے استدلال میں گو سر ٹوٹ پھوٹ سکتے ہیں لیکن مدمقابل کا استدلال نہیں ٹوٹتا بلکہ اور مضبوط اور راسخ ہو جاتا ہے۔ ایسی حجتیں بحث مباحثہ سے طے نہیں ہوتیں۔ ہوتا ہے یہ کہ ماحول ایسی ضرورتیں اور رجحانات پیدا کر دیتا ہے کہ بعض آدمی زبانی اور لاٹھی کے استدلال سے الگ اور حوالی سے متاثر ہو کر اپنے مذاق کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ جو لوگ زبانی کٹ حجتی سے اکتا چکے ہیں اور جن کو نئے خیالات کے ظاہر کرنے کی عملی مجبوریاں پیش آ رہی ہیں وہ چپ چاپ اُن کے پیچھے ہو لیتے ہیں پہلے پہل یہ نئی چال والے ذرا جھجکتے جاتے ہیں ڈرتے ہیں معذرت کرتے ہیں لیکن آخر میں چل کر عادت مطمئن کر دیتی ہے اور جدت کا ناز حوصلے بڑھا دیتا ہے۔ بھیڑیا چال بڑی سخت جان ہوتی ہے اور بہت ہی پیر پیٹ پیٹ کر جان دیتی ہے چند انتہا پسند پرانی چال والے ضرور کہیں نہ کہیں بچے کچے رہ جاتے ہیں اور اُن کی زبان اور قلم سے کٹ حجتی کی گونج نکلتی رہتی ہے۔ قومی زندگی کے بہاؤ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پرانی بھیڑیا چال والوں کے دن پھر جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے اس قسم کا اُلٹا بہاؤ عموماً عارضی ہوتا ہے اور اسے پرانی بھیڑیا چال کا دم واپسیں سمجھنا چاہیئے۔

سر سید کی پُر زور شخصیت نے مسلمانوں کو صرف تعلیم کے راستہ پر ہی نہیں ڈالا اُنہوں نے اردو ادب میں بھی نئی روح پھونکی۔ اردو پر زبان انگریزی کا اثر ہونے لگا اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ انگریزی الفاظ ترکیبیں اور طرز ادا کی اردو میں بھرمار ہونے لگی۔ پرانے شاعر اور انشا پرداز ناک بھوں چڑھاتے ہی رہے جوں جوں

مسلمان نوجوان انگریزی ادب سے مانوس ہوتے گئے اپنی زبان کی کمزوری کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اُن کی اُردو تحریر اور تقریر میں انگریزی ٹھسنے لگی۔ اِن اصحاب کی بات چیت سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس ناچیز کے ایک کرم فرما کو انگریزی اس قدر چڑھ گئی تھی کہ وہ اپنی گھروالی کو بات چیت میں ہمیشہ میری وائف (wife) فرماتے اور خسر صاحب کو میرے فادران لا (Father-in-Law) کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ فرمانے لگے۔

"مائی ڈیر بائے My dear boy میں بہت ہی لکی (Lucky) ہوں کہ مجھے اِن ڈین لیڈیز (Indian ladies) میں ایسی وائف (Wife) مل گئی۔ بہت ہی تھوڑے وقت میں میرے لیکچروں کا اثر دیکھیئے کہ فیشن میں اپ ٹوڈیٹ (Up-to-date) ہوگئیں ہمارے۔ ہاں کی باربے رین (Barbarian) رسوم اور عادتوں کو گیو اَپ (Give-up) کر دیا اور اس قدر سینسی بل (Sensible) ہوگئیں ہیں کہ مجھے ورڈس (Words) نہیں ملتے کہ اُن کی تعریف کرسکوں۔"

ایک ظریف حضرت بھی تشریف رکھتے تھے سب کچھ سُن کر فرمانے لگے۔

"ریلی لی (Really) آپ نے اپنی چارمنگ وائف (Charming wife) کی جو تعریف کی ہے میں تو بن دیکھے چارمڈ (Charmed) ہوگیا۔ آپ کے قول سے وہ اب باربے رین (Barbarian) رسوم سے بھی اپنے آپ کو امان سی پیٹ (Emancipate) کر چکی ہیں لہٰذا میں اس دن کو لک فارورڈ

ملاقات بے تکلف سے ان ہیں کہ ہوں کرتا (Look forward) کا آنر (Honour) حاصل ہوگا اور پروانوں کی طرح ان کی وٹ اور بیوٹی (wit and beauty) کی شمع پر گرا کرینگے۔

ہر خیال قومی زندگی میں ایک لنگر کی طرح حرکت کرتا ہے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہونچتا لیکن اس طرح پینگ لینے میں ایک ایسے نقطے پر سے بھی گذرتا ہے جو اوسط ہے اور جہاں اس کی صورت ایسی ہوتی ہے کہ عمل کا جامہ اختیار کر سکے۔ انگریزیت کی جب یہ نوبت پہونچی جس کا ذرا سا نمونہ ابھی پیش کیا گیا ہے اور دوسرے سرے پر دلی اور لکھنؤ کے وہ لوگ موجود تھے جو مولانا حالی کو اہل زبان نہیں مانتے تھے اور اُن کی زبان کو ٹکسال باہر تو نہیں البتہ قابل سند نہیں گردانتے تھے۔ تو ساتھ ہی چند ایسے بھی کام کے لوگ چپکے چپکے کام کر رہے تھے جو نہ تو انگریزی کی اندھا دھند بھرمار کو اچھا جانتے تھے اور نہ انگریزی سے ایسے سخت پرہیز کو قابل وقعت سمجھتے تھے کہ انگریزی کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔ ان لوگوں نے یہ کیا کہ حسب ضرورت ایسے انگریزی لفظ ضرور استعمال کئے جن کے لئے اردو میں الفاظ موجود نہ تھے اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا کہ جملوں کی ساخت اور محاورات ٹکسالی اُردو کے ہی رہیں۔

پھر ایک دَور آیا کہ انگریزی دان اور غیر انگریزی دان اُردو کے ارباب قلم یہ کوشش کرنے لگے کہ جہاں تک ممکن ہو اُردو میں انگریزی الفاظ کے ہم معنی الفاظ گھڑے جائیں۔ یا فارسی اور عربی کے لفظوں سے کام لیا جائے اس خیال نے انتہائی صورت سر اقبال اور مولانا ابو الکلام کی نظم اور نثر میں اختیار کی جن کے نمونے دینے کی حاجت نہیں اس لئے کہ ایک کی نظمیں اور دوسرے کے مضامین ابھی تک اُردو دان دنیا کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

اِس طرح اُردو ادبیات میں کئی چالیں اس وقت جیت پانے کی کوشش کر رہی ہیں اور ہر چال کے کم و بیش پیرو اپنا زورِ قلم دکھا رہے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ ترقی کے معنی یہی ہیں کہ نئی نئی چالیں نکالی جائیں اور اُن کو اوروں کے لیئے بھیڑیا چال بنایا جائے تو ہر اُردو کے بہی خواہ کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اُردو داں لوگوں کے سامنے نئی چالیں پیش کی جائیں۔ بھیڑیا چال والے احباب ذرا اس خیال سے بدکیں گے لیکن ذرا سے غور کے بعد معلوم ہوگا کہ اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں اگر پیش کردہ چال کو وہ نامقبول بنانے میں کامیاب ہوئے تو وہ بیچاری اپنے آپ چپ چاپ مر جائے گی۔ اور بفرضِ محال اگر نئی چال مقبول ہوئی تو چند الوالعزم اہلِ قلم اس کو اپنے لیئے بھیڑیا چال قرار دے لیں گے اور اِس طرح اُردو اَدب میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جائیگا۔ اب رہا یہ سوال کہ موجودہ بھیڑیا چالوں کے فدائی، کبھی نہ مانیں گے اور سخت خفا ہو جائیں گے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اُن کی خفگی زبان یا قلم سے نکل جائے تاکہ بھڑاس کے نکلجانے کے بعد وہ شاید ٹھنڈے دل سے سوچ سکیں۔ اِس پر بھی اگر اُن کے طیش کا جوالا مکھی گرما گرم ہی رہے تو کیا مضائقہ۔ اِنسان کو طبعاً لڑائی میں مزہ آتا ہے لڑائی توپ و تفنگ کی ہو یا قلم اور زبان کی اَدبی دُنیا کے رسالہ میں حضرات کی ضیافت طبع ہوتی رہے گی۔

یہ طول طویل تمہید محض اِس لیئے تھی کہ ناظرین کرام کے سامنے دو نئی چالیں پیش کی جائیں۔ اُن کے پیش کرنے کا مُدعا صرف اِتنا ہے کہ اُن سے اُردو کے دائرۂ اَدب میں وسعت ہو اور اُردو کو ہندوستان پر چھا جانے میں مدد ملے۔

اہلِ زبان، کے مسئلہ پر بہت غور کرنے کے بعد بھی خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ دہلی اور لکھنؤ کے ہی لوگوں کو کیوں اہلِ زبان کہا جاتا ہے؟ اور کیوں اور

مقامات کے لوگ اِن دو شہروں کے نام سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بھیگی بلی بنجاتے ہیں؟ ''اہلِ زبانی'' کے اگر یہ معنی لیئے جائیں۔ جو عام طور پر لیئے جاتے ہیں۔ کہ دِلّی کی چار دیواری کے لوگوں کی زبان اُردو کی عمدگی کی کسوٹی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے یہ معنی کیوں لیئے جائیں کہ دلّی کی زبان ہمیشہ کسوٹی رہے گی؟ ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ کی زبان پھوٹی کوڑی کی وقعت نہیں رکھتی تھی اور دِلّی والے اُن کی پُوربی زبان اور گنوارو لہجہ پر ہنسا کرتے تھے۔ یہ سوچنے کے قابل بات ہے کہ لکھنو والوں کو جو اب اہلِ زبان ہونے کا رتبہ حاصل ہے وہ کس طرح حاصل ہوا؟ اس کی وجہ صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ لکھنؤ میں اعلیٰ شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوئے اور اِس طرح اِس شہر والوں نے اپنی قابلیت اور اُستادی سے ثابت کر دیا کہ جو لوگ زبان کو مانجھنے اور زبان میں عمدہ خیالات کے ادا کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں وہ ایک دن خود ''اہلِ زبان'' کا لقب حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ نے اُردو میں ایسے اَدبی نمونے پیش کیئے کہ دِلّی کے مغرور ''اہلِ زبان'' حضرات کو لکھنؤ کا سکہ ماننا پڑا۔ اب اِسی اِستدلال کو دوسرے مقامات تک پھیلا دیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ''اہلِ زبانی'' کے دعوے صرف ان دو شہروں کی چار دیواری تک محدود رہیں جس طرح لکھنؤ نے اپنی پُوربی گنوار زبان کے باوجود ''اہلِ زبان'' ہونے کا رتبہ حاصل کیا اسی طرح ہندوستان میں جہاں جہاں اُردو بولی جاتی ہے وہاں کے لوگ کیوں یہ رتبہ حاصل نہ کریں؟ یہ کیا ضرور ہے کہ صرف دِلّی اور لکھنؤ کی زبان اور محاورے ہی اُردو سمجھے جائیں جبکہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اُردو مادری زبان کی طرح گھروں میں بولی جاتی ہے اور لوگ اپنی روزمرہ زندگی کے کاروبار اسی اپنی بولی میں کرتے ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ دِلّی اور لکھنؤ کے حضرات نے جان کر یا انجان طور پر اپنی شیخی اور اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اِس بات کی ہمیشہ کوشش کی کہ "اہلِ زبانی" کی دھاک بٹھاتے رہے۔ جہاں کسی باہر والے نے منھ کھولا اور زبان ہلائی اور اُنہوں نے کہا۔

"یہ بیچارے وہاں کے رہنے والے زبان کیا جانیں؟
پہلے اہلِ زباتوں کی صحبت اُٹھائیں۔ کسی مستند اہلِ زبان
شاعر سے اصلاح لیں تب جا کر کہیں کچھ کہہ سکیں گے۔
اِن بیچارے کی غزل کا کوئی شعر ایسا نہیں جس میں زبان
کی خامی نہ ہو!"

مزے کی بات تو یہ ہے کہ اہلِ زبان حضرات کی اِس ہیکڑی اور دھاندلی سے اچھے اچھے لائق فائق چین بول گئے اور اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اِس زمانہ میں بھی کہ آزادی کا دور دورہ ہے دِلّی اور لکھنؤ کا اِستبداد بدستور باقی ہے اور اِن شہروں کی تتبع پر بڑے بڑے اہلِ قلم اور شاعر فخر کرتے ہیں یہ ایک خطرناک اِستبداد ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن کو غیر اہلِ زبان کہا جاتا ہے وہ ڈر کے مارے بول نہیں سکتے اور اُن کے خیالات کی فطری رَو جو اُن کی روزمرہ میں بے تکلف لہریں مارے دِلّی اور لکھنؤ کی غلامانہ تتبع سے رُک سی جاتی ہے۔ وہ بیچارے ڈرتے ڈرتے زبان کھولتے ہیں کہ کہیں زبان نہ پکڑی جائے۔ بہت سے اچھے دماغوں کی بہت سی قوت اور توانائی اس سعی میں ضائع ہوتی ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے اہلِ زباتوں کی سی زبان اور اُن کی محدود چار دیواری کے محاوروں کا مطالعہ اور اُن پر پورا پورا عبور مع اسناد حاصل کریں۔

یہ 'اہلِ زبانی' کا مسئلہ ایک زہریلا ڈھکوسلا ہے اور اُردو کی وسعت اور ترقی کے لیے سمِ قاتل۔ اُردو کے پھیلاؤ اور رواج میں یہ ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ دِلّی اور لکھنؤ کی فصیلوں کے باہر والے ہونہار نونہال بچپن ہی سے اِس 'ہیچائے' سے ڈرائے جاتے ہیں اور اُن کے نفوس میں غلامانہ رجحان پیدا کیا جاتا ہے۔ بڑے ہو کر بھی وہ اپنے خیال کے اظہار میں آزاد نہیں ہوتے وہ کوئی لفظ محاورہ یا ترکیب ایسی استعمال نہیں کر سکتے جو 'اہلِ زبان' کے ہاں نارَوا ہو اور اِس طرح اُن کا خیال کیسا ہی اَنوکھا اور جدت میں ڈوبا ہوا ہو لیکن نئی تراش خراش کے بغیر لفظوں کا جامہ نہ پہن سکتا ہو وہ اس ڈر کے مارے کہ بس 'اہلِ زبانی' اجازت نہیں دیتی کہ اپنا خیال فطری الفاظ میں ادا کیا جائے اپنے خیال کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

اَب وقت آگیا ہے کہ اِس ڈھکوسلے کو توڑ پھوڑ دیا جائے۔ اہلِ زبان بزرگواروں کا بڑا استدلال یہ ہے کہ زبان کا کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ بحث کی غرض سے اِس معیارِ زبان کی ضرورت کو مان لیجئے اور یہ بھی مان لیجئے کہ دِلّی میں زبان اُردو پہلے منجھی اور شستہ اور شائستہ بنائی گئی اور دِلّی والوں نے زبان کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ تو بھی اول تو یہ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ دِلّی کی زبان 'معیار' سمجھی جائے۔ دوسرے یہ کہ جب لکھنؤ نے اپنی زبان کو 'معیار' بنا دیا اور اِس بات کو وہاں کے شعرا اور اہلِ قلم نے اپنے زورِ قلم سے منوا دیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اور مقامات کے لوگ بھی ایسا کر سکتے ہیں اور اسی وقت ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ 'اہلِ زبانی' کے غلامانہ رعب کو اپنے دماغوں سے نکالیں اور بے تکلف اور بے تکان اپنے خیالات کو اپنی زبان میں بہترین طریقہ پر ادا کریں یعنی اپنے اظہارِ خیال میں آزاد ہو جائیں اور اپنی جیتی جاگتی گھروں کی بولی میں اپنا خیال ادا کریں۔

یہ نہ کریں کہ بزدل بن کر دِلّی یا لکھنؤ کی نقالی کریں اور اِس طرح اپنے خیال کے بہاؤ کو غیر فطری طور پر بند پانی کی طرح سڑا دیں کیا ہمارے نوجوان اِتنی جراءت سے کام لیں گے کہ اِس نئی چال کو اپنی بھیڑیا چال بنائیں اور دِلّی اور لکھنؤ کے اِس زہریلے اِستبداد کو اپنے کنوارے دماغوں سے دور رکھیں؟

اچھا اَب ایک ننھی سی نئی چال اور ملاحظہ ہو اور بس۔ اِس چال کا انوکھا پن ہی ہماری رائے میں دلفریب ہے اور بہت سے نوخیز جری دماغ آسانی سے اُس کے دلدادہ ہو جائیں گے۔ زبان اُردو کا ایک زبردست مسئلہ یہ ہے کہ بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کا کیا اُصول قرار دیا جائے؟ تذکیر و تانیث کی فطری علامتیں وہ اعضاء رکھے گئے ہیں جنھیں ہمارے گھروں میں بچوں کے معصوم طور سے پُوچھنے پر گندی چیزیں بتایا جاتا ہے۔ بے جان اشیاء میں یہ گندی چیزیں سرے سے ہوتیں ہی نہیں۔ اَب آپ ہی اِنصاف سے فرمائیں کہ جب ایک بات کی جڑ ہی نہ ہو تو پھر ایسے اُمور میں کوئی اُصول کس طرح ہاتھ آ سکتا ہے۔ خدا بھلا کرے "اہلِ زبان" کی دیوی کا کہ بڑی بڑی مغز پاشی کے بعد آخر یہی طے کرنا پڑا کہ غیر ذی روح کی تذکیر اور تانیث کا یہی ایک گُر ہو سکتا ہے کہ اُن معاملات میں "اہلِ زبان" حضرات کی تتبع کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اُصول نہیں بیکڑ ہی سے غلامانہ رَوِش ہے۔ فہمِ عامہ بتاتی ہے کہ غیر ذی رُوح میں تذکیر اور تانیث کا پیدا کرنا ایسا ہی ہے کہ ایک ہیجڑے سے اولاد کی توقع کی جائے۔ لہٰذا اصُول یہ ہونا چاہئیے کہ غیر ذی رُوح کی تذکیر اور تانیث کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ عام اجازت ہو کہ بیجان اشیاء کو جس کا جی چاہے مذکر بُولے اور جس کا جی چاہے مونث۔ زبان فارسی کی بہت سی کارآمد اور بیکار باتوں میں تتبع کی گئی ہے فارسی کی شیریں ترکیبیں لی گئیں۔ فارسی طرزِ انشاء کی نقل کی گئی اُردو نظم اور نثر میں شعراء

عبارتیں فارسی کے نمونوں پر ڈھالی گئیں۔ اگر تذکیر اور تانیث میں فارسی کی پیروی کی جاتی تو آج اُردو کس قدر سہل ہو جاتی، اور اب جتنی پھیلی ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ ہندوستان بھر میں پھیل جاتی۔

اب ہمارے جوان دماغوں کی ہمت اور جرات ہی اِس غیر ذی رُوح کی تذکیر اور تانیث کی بے ضرورت اور غیر فطری پیچ کو نکال سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اِس نئی چال کو اختیار کریں گے؟